لکھنؤ کی پانچ راتیں

سردار جعفری

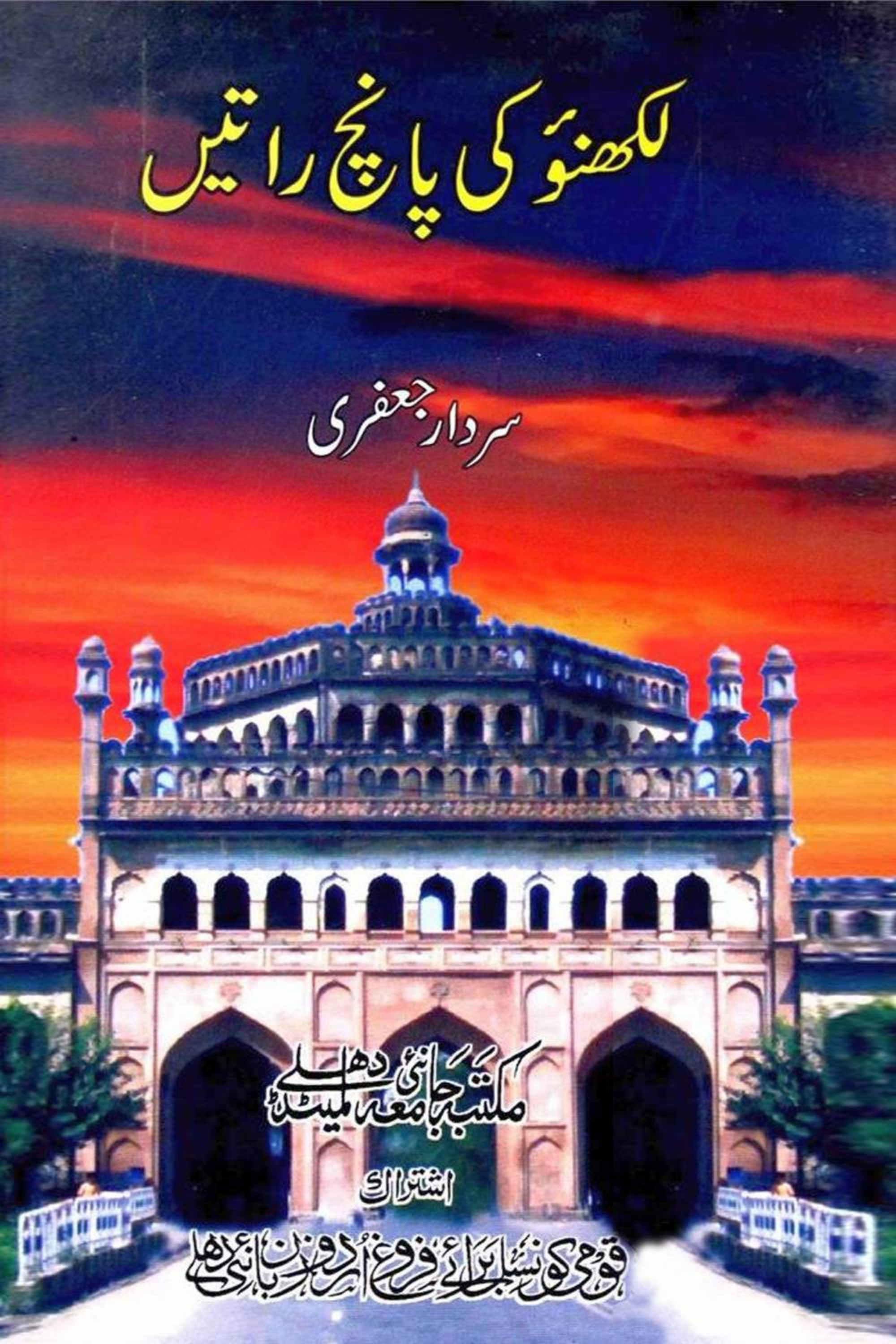

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

www.taemeernews.com

لکھنؤ کی پانچ راتیں

سردار جعفری

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

www.taemeernews.com

© جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

Lucknow ki Panch Ratain
by
Sardar Jafri
Rs.91/-

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 ☎ 011-26987295

Email: monthlykitabnuma@gmail.com

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔110006 ☎ 011-23260668

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی۔400003 ☎ 022-23774857

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔202002 ☎ 0571-2706142

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 ☎ 011-26987295

قومی اردو کونسل کی کتابیں مذکورہ شاخوں پر دستیاب ہیں

سنہ اشاعت: 2013 تعداد: 1100 قیمت: -/91روپے

ISBN :978-81-7587-944-7 سلسلۂ مطبوعات:1726

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025
فون نمبر: 49539000 فیکس: 49539099
ای میل: urducouncil@gmail.com ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: الہوتی پرنٹ ایڈز، جامع مسجد دہلی۔110006
اس کتاب کی چھپائی میں 70 GSM INPL Maplitho کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے۔

www.taemeernews.com

چند معروضات

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے، جس نے معتبر ادیبوں کی سینکڑوں کتابیں شائع کی ہیں اور اپنے ماضی کی شان دار روایات کے ساتھ آج بھی سرگرم عمل ہے۔ مکتبہ کے اشاعتی کاموں کا سلسلہ ۱۹۲۲ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا جو زمانے کے سرد و گرم سے گزرتا ہوا اپنی منزل کی طرف گامزن رہا۔ درمیان میں کئی دشواریاں حائل ہوئیں۔ نامساعد حالات نے سمت و رفتار میں خلل ڈالنے کی کوشش بھی کی مگر نہ اس کے پائے استقلال میں لغزش ہوئی اور نہ عزم سفر ماند پڑا، چنانچہ اشاعتوں کا تسلسل کلی طور پر کبھی منقطع نہیں ہوا۔

مکتبہ نے خلاق ذہنوں کی اہم تصنیفات کے علاوہ طلبا کی نصابی ضرورت کے مطابق درسی کتب بھی شائع کیں اور بچوں کے لیے کم قیمت میں دستیاب ہونے والی دل چسپ اور مفید کتابیں بھی تیار کیں۔ ''معیاری سیریز'' کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی اشاعت کا منصوبہ بنایا اور اسے عملی جامہ پہنایا اور یہی عمل اس کا نصب العین قرار پایا۔ مکتبہ کا یہ منصوبہ بہت کامیاب رہا اور مقبول خاص و عام ہوا۔ آج بھی اہل علم و دانش اور طلبا مکتبہ کی مطبوعات سے تعلق خاطر رکھتے ہیں۔ درس گاہوں اور جامعات میں مکتبہ کی مطبوعات کو بہ نظرِ استحسان دیکھا اور یاد کیا جاتا ہے۔

ادھر چند برسوں سے اشاعتی پروگرام میں کچھ تعطل پیدا ہو گیا تھا جس کے سبب فہرست کتب کی اشاعت بھی ملتوی ہوتی رہی مگر اب برف پگھلی ہے اور مکتبہ کی جو کتابیں کم یاب بلکہ نایاب ہوتی جا رہی تھیں ان میں سے دو سو نائشنل قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے شائع ہو چکے ہیں اور ان سے زیادہ قطار میں ہیں (اسی دوران بچوں سے تعلق رکھنے والی تقریباً سو کتابیں مکتبہ نے بلاشرکتِ غیرے شائع کی ہیں)۔ زیر نظر کتاب مکتبہ جامعہ اور قومی کونسل کے مشترکہ اشاعتی سلسلے کی ہی ایک کڑی ہے۔

www.taemeernews.com

مکتبہ کے اشاعتی پروگرام کے جمود کو توڑنے اور اس کی ناؤ کو بھنور سے نکالنے میں مکتبہ جامعہ کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کے چیرمین محترم جناب نجیب جنگ صاحب (آئی اے ایس) وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے جس خصوصی دل چسپی کا مظاہرہ کیا ہے وہ یقیناً لائق ستائش اور ناقابلِ فراموش ہے۔ مکتبہ جامعہ ان کا ممنون احسان رہے گا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اربابِ حل وعقد کا شکریہ بھی ہم پر لازم ہے جن کے پُرخلوص تعاون کے بغیر یہ اشتراک ممکن نہ تھا۔ اولین مطبوعات میں کونسل کے سابق ڈائرکٹر کے تعاون کا کھلے دل سے اعتراف کیا جاچکا ہے۔ مکتبہ کی باقی کتابیں کونسل کے موجودہ فعال ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین صاحب کی خصوصی توجہ اور سرگرم عملی تعاون سے شائع ہورہی ہیں، جس کے لیے ہم ان کے اور کونسل کے وائس چیرمین پروفیسر وسیم بریلوی صاحب کے ممنون ہیں اور تہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ امید کرتے ہیں کہ مکتبہ کو ہمیشہ ان مخلصین کی سرپرستی حاصل رہے گی۔

خالد محمود
مینجنگ ڈائرکٹر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

www.taemeernews.com

تمہید

یہ کتاب کسی اسکیم کے تحت نہیں لکھی گئی ہے۔ نہ تو اس کا مطلب اپنی آپ بیتی لکھنا ہے۔ اور نہ بکھری ہوئی یادوں کو مرتب کرنا۔ یہ اس افسانے کے چند پریشان ٹکڑے ہیں جسے زندگی کہتے ہیں اور یہ مختلف اوقات میں مختلف مقامات پر لکھے گئے ہیں، اس لئے ان میں اسلوب اور بیان کی سطح کو قائم رکھنا ناممکن ہے، اس وقت ان مضامین کو کتابی شکل دیتے ہوئے بھی میں نے نظر ثانی کی ضرورت نہیں سمجھی، کیوں کہ اس میں پھیکے اور شوخ مختلف رنگ ہیں، بعض واقعات مضحکہ خیز ہیں۔ بعض اندوہناک اور تکلیف دہ۔ ان مضامین میں اس رومانیت اور بغاوت کی جھلکیاں بھی ملیں گی، جس سے ۱۹۳۰ء کے بعد کی تحریکیں اور ترقی پسندی متاثر ہوئی آوارہ گردی کے باوجود اس عہد کے رومانی باغیوں کے سامنے ایک اعلیٰ نصب العین تھا بقول غالبؔ ؎

شیوۂ رندانِ بے پروا خرام از من مپرس
ایں قدر دانم کہ دشوار است آسان زیستن

ممکن ہے کہ بعض واقعات اپنی تفصیلات میں پوری طرح اپنی صحت برقرار نہ رہ رکھ سکے ہوں کیونکہ حافظے کی فریب کاریاں اور یادوں کی رنگ آمیزیاں عجیب وغریب ہوتی ہیں، کبھی کبھی وقت کے بُعد کی وجہ سے واقعات کی ترتیب میں بھی

www.taemeernews.com

فرق آجاتا ہے، پھر بھی کسی واقعے کی صحت میں شبہ نہیں ہے اور داخلی صداقت میں کسی قسم کا کھوٹ نہیں ہے۔

مجھے اس کتاب کے مرتب کرنے کا خیال کبھی نہیں آیا تھا، لیکن ادھر جب اردو بلٹز میں "لکھنؤ کی پانچ راتیں" کا سلسلہ شائع ہوا اور پڑھنے والوں کو پسند آیا، تو احباب کے اصرار کے سامنے میں نے سپر ڈال دی۔ منتشر اور غیر مرتب سہی لیکن پھر بھی ان یادوں کے تانے بانے سے بہت سی ایسی تصویریں بنیں گی جو اس عہد کے پڑھنے والوں کو پرانے عہد کے سمجھنے میں تھوڑی سی مدد دیں گی۔

میں خاص طور سے شاہد علی خاں صاحب کا شکر گذار ہوں جن کی امداد اور تعاون کے بغیر اس کتاب کی اشاعت ناممکن تھی۔

بمبئی۔ ۵ فروری ۶۴ء

سردار جعفری

www.taemeernews.com

نیا ایڈیشن

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن جولائی ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا تھا، دوسرا ہندوستانی ایڈیشن اب ۱۹۸۸ء میں شائع ہو رہا ہے، اس کو بہت پہلے شائع ہو جانا چاہیئے تھا۔ اس درمیان میں دو سال پہلے کراچی سے پاکستانی ایڈیشن شائع ہوا۔

پیشِ نظر کتاب کا ایک مضمون "دیکھ آکر کوچۂ چاک گریباں کی بہار" پاکستان میں کئی بار مختلف رسائل اور کتابوں میں نقل ہو چکا ہے۔ اس کتاب میں شامل رپورتاژ "چہرہ در چہرہ" کو کہانی کا نام دے کر دنیا کی آٹھ دس زبانوں میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ پہلا ترجمہ روسی اور پولش زبانوں میں شائع ہوا تھا۔ میری شاعری پر ہندوستان سے باہر جو مضامین لکھے گئے ہیں، ان میں بھی "چہرہ در چہرہ" کا ذکر اکثر آیا ہے۔ دوسرے مضامین بھی الگ الگ کئی بار نقل ہوئے ہیں، گویا وہ اس کتاب کے بکھرے ہوئے ایڈیشن تھے۔

مکمل کتاب کا ایڈیشن اشاعت کے لئے تین سال سے کتابت شدہ شکل میں تیار ہے، لیکن پبلشر کی طرف سے محبوب کے وعدۂ فردا سے بھی زیادہ خوب صورت وعدے کئے گئے اور ہنوز روزِ اوّل ہے۔

اب میرے عزیز دوست عابد سہیل اس کو نصرت پبلشرز لکھنؤ کی طرف سے شائع کر رہے ہیں، یہ اشاعت پہلی اشاعت ہی کی طرح ہے۔ بس ایک باب "کوچۂ چاک گریباں کی بہار" میں چند سطروں کا اضافہ فیض کے انتقال کے بعد کیا گیا ہے۔

سردار جعفری

بمبئی، ۲۰ر جون ۱۹۸۷ء

www.taemeernews.com

سردار جعفری کی دوسری کتابیں

نئی دنیا کو سلام	(طویل تمثیلی نظم)
خون کی لکیر	(نظمیں)
ایشیا جاگ اُٹھا	(طویل نظم)
امن کے ستارے	(طویل نظم)
پتھر کی دیوار	(نظمیں)
ایک خواب اور	(نظمیں)
پیراہن شرر	(نظمیں)
لہو پکارتا ہے	(نظمیں)

●

ترقی پسند ادب (نثر)

اقبال شناسی (اقبال پر تین مضامین)

پیغمبران سخن

(کبیر، میر اور غالب پر مضامین)

●

www.taemeernews.com

فہرست

قبولِ بندگیم را خدائے برنمی خیزد	۱۱
لکھنؤ کی پانچ راتیں	۳۷
چہرہ ما نجھی	۸۶
خالِ محبوب اور امنِ عالم	۱۱۵
گلینا	۱۱۹
ذوقِ تعمیر	۱۳۳
گردشِ پیمانۂ رنگ	۱۵۷

www.taemeernews.com

قبول بند گیم راخدائے برمی خیزد

مجھے انسانی ہاتھ بڑے خوب صورت معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی جنبش میں ترنم ہے اور خاموشی میں شاعری۔ ان کی انگلیوں سے تخلیق کی گنگا بہتی ہے۔ یہ وہ فرشتے ہیں جو دل و دماغ کے عرشِ بریں سے وحی و الہام لے کر کاغذ کی حقیر سطح پر نازل ہوتے ہیں اور اس پر اپنے لافانی نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ ان کاغذوں کو دنیا نظم اور افسانہ، مقالہ اور کتاب کہہ کر آنکھوں سے لگاتی ہے اور ان سے روحانی تسکین حاصل کرتی ہے۔

انسان کے تسلسل میں حیاتیاتی عمل کارفرما ہے جو باپ سے بیٹے کی شکل اختیار کرتا ہے۔ لیکن انسانیت کا تسلسل ہاتھوں کی تخلیق کا رہینِ منت ہے، یہ تخلیق بظاہر بے جان ہوتی ہے، لیکن جانداروں سے زیادہ جاندار ہوتی ہے۔ ہاتھوں کے بغیر نہ جنگ ممکن ہے نہ امن۔ محبت ممکن ہے نہ نفرت، یہی ہاتھ گلے میں حمائل ہوتے ہیں اور یہی ایک دوسرے کو چھوڑ کر دل کی دھڑکنیں تیز کر دیتے ہیں۔ ساز میں سوتے ہوئے نغمے ان ہاتھوں سے ہی پیدا ہوتے ہیں ہم آغوشی کے لئے پہلے یہی آگے بڑھتے ہیں، اور رخصت کے وقت یہی سب کے بعد پیچھے ہٹتے ہیں۔ یہ وصال و فراق کی حسین علامتیں ہیں، جس طرح ذہن اپنے آپ کو خیال میں تبدیل کر کے اس کو اپنے وجود سے الگ کر دیتا ہے اور وہ خیال ذہن انسانی سے بھی

www.taemeernews.com

زیادہ طاقتور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہاتھ اپنے آپ کو قلم اور تلوار، مشین اور اوزار میں تبدیل کر کے انھیں اپنے وجود سے الگ کر دیتے ہیں اور وہ چیزیں ہاتھوں سے بھی زیادہ طاقت ور اور خلّاق بن جاتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ میں نے ہمیشہ قلم کو ہاتھوں کا تقدس، ذہن کی عظمت اور قلب انسانی کی وسعت سمجھا ہے۔ اور قلم کے بنائے ہوئے ہر نقش کو سجدہ کیا ہے، اس لئے جب قلم جھوٹ بولتا ہے، یا چوری کرتا ہے تو مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میرے ہاتھ گندے ہو گئے ہیں۔ میں ہر ادیب سے توقع کرتا ہوں کہ وہ اپنے قلم کا احترام کرے گا کیونکہ اس کے نفس کی عزت اور شرافت اسی طرح برقرار رہ سکتی ہے۔

میں اپنے بچپن میں ایک تختی لکھا کرتا تھا، جس پر ہزاروں بار نہیں تو سینکڑوں بار اس شعر کی مشق کی ہے ؎

قلم گوید کہ من شاہ جہانم　　قلم کش را بدولت می رسانم

ممکن ہے کسی کے لئے یہ دولت چاندی، سونا ہو، کیونکہ دنیا میں ضمیر فروشوں کی طرح قلم فروشوں کی بھی کمی کبھی نہیں رہی ہے، لیکن میرے لئے یہ علم، ہنر، خلوص، اور صداقت کی دولت ہے، اور قلم کے احترام کے معنی اس دولت کا احترام ہے، اور احترام کا جذبہ ہی بار بار میرے قلم کو روک رہا ہے۔

کیا میرا قلم صداقت کو پیش کر سکے گا۔ صداقت کوئی سپاٹ حقیقت نہیں ہے، یہ ایک ایسا ہیرا ہے جو برابر تراشا جا رہا ہے، اور زندگی اور عمل کی جلا اس میں نیا نور اور نیا رنگ پیدا کر رہی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ صداقت بدل جاتی ہے، دراصل اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اچھے شعر اور اعلیٰ فن کی طرح صداقت تہ دار ہوتی ہے۔ اس لئے کبھی کوئی تنہا انسان، کوئی تنہا قوم، کوئی تنہا نسل، اس کا احاطہ نہیں کر سکی ہے، اور نہ کوئی تنہا نظریہ اس پر حاوی ہو سکا ہے۔ ناتمامی اس کی خصوصیت رہی ہے، اور اس ناتمامی میں بلا کا حسن ہے۔

www.taemeernews.com

اس سے بھی زیادہ مشکل اس صداقت کا پیش کرنا ہے جس کا تعلق اپنی ذات سے ہو، انسان اپنے دل سے جتنے جھوٹ بولتا ہے اتنے جھوٹ دنیا کے سامنے نہیں بولتا اور اپنے جھوٹ کو سچ کی جھلک دینے کے لئے وہ کبھی جادوگری سے کام لیتا ہے، اور کبھی فریب کاری سے۔ دنیا سے جھوٹ بولنے کے لئے پہلے اپنے دل سے جھوٹ بولنا ضروری ہے؛ اس لئے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے اور بھی ڈرتا ہوں کہ مجھے اپنی زندگی میں شخصیات اور واقعات نے متاثر کیا ہے۔

وقت کے ساتھ بیتی ہوئی یادوں کے نقوش بدل جاتے ہیں۔ ایک نقش دوسرے نقش میں مل جاتا ہے اور تصویریں مسخ ہو جاتی ہیں۔ تعبیروں کے تپتے ہوئے میدان سے خوابوں کی ٹھنڈی اور سکون بخش چھاؤں دکھائی نہیں دیتی۔ اور ہم اکثر نئے خواب تخلیق کر کے انھیں پرانے خوابوں کا نام دے دیتے ہیں۔ عمر کے چوالیس سالوں میں ہزاروں دنوں اور ہزاروں راتوں کی شکنیں پڑی ہیں اور ہر شکن میں لاکھوں لمحے سو رہے ہیں۔ ان کو جگانے کی ہمت کس میں ہے۔ قہقہوں کے مرجھائے ہوئے پھول، آنسوؤں کے جمے ہوئے موتی، ابروؤں کی ٹوٹی ہوئی کمانیں، رخساروں کی بجھی ہوئی شمعیں، کتابوں کے پھٹے ہوئے ورق، علم شعور، رشک، حسد، محبت، نفرت، حماقت، رعونت سب ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے ہوئے ہیں۔ آج یہ بتانا مشکل ہے کہ کس نے کیا سکھایا ہے کس نے اثر ڈالا ہے۔ شعوری اثرات اور غیر شعوری اثرات کے درمیان لکیر کھینچنا مشکل ہے۔

میری یادوں میں ایک کھنڈر ابھر رہا ہے۔

کھنڈر کبھی کسی کھوئی ہوئی عظمت کا پتہ دیتے ہیں اور کبھی کسی عظمت کے بغیر بھی انحطاط کی داستان سناتے ہیں۔ ہر کھنڈر کے لئے قدیم ہونا ضروری نہیں ہے

www.taemeernews.com

ایسے کھنڈر بھی ملتے ہیں جن کی ہر اینٹ سلامت ہوتی ہے، ہر دروازہ کھلتا ہے، اور دیوار کھڑی ہوتی ہے. پھر بھی عمارت کو دیکھ کر اس پر کھنڈر کا گمان گذرتا ہے. دیواروں پر بغیر حروف کی ایک کہانی لکھی ہوتی ہے. دروازے بغیر زبان کا ایک افسانہ سنا رہے ہیں اور ارد گرد کی ہواؤں سے بوسیدگی کی بارش آرہی ہے. میں جس کھنڈر کا ذکر کر رہا ہوں، وہ ایسا ہی ہے، اس کو دیکھتے ہی دل میں ویرانگی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے.

بمبئی سے ہزار ڈیڑھ ہزار میل دور شمال میں ہمالیہ کی ترائی کا دامن جہاں سے پہاڑ کی برف پوش چوٹیاں دکھائی دیتی ہیں. پندرہ بیس ہزار کی آبادی کا ایک چھوٹا سا قصبہ بلرام پور ایک تعلقہ داری کی راجدھانی ہے، تعلقہ داری کو ریاست کہتے ہیں اور تعلقہ دار کو مہاراجہ. اس قصبے کی ایک پتلی سی گرد آلود سڑک کے کنارے ایک اصطبل جس میں گھوڑوں کے لئے چھ تھان ہیں، سائیسوں کے لئے دو کوٹھریاں، اور موٹروں اور گاڑیوں کے لئے تین گراج. میرے بچپن میں ہر تھان پر گھوڑے تھے، ہر کوٹھری میں سائیس، اور ہر گراج میں موٹر یا بگھی. اب ایک گراج میں ایک پرانا تانگا ہے اور دوسرے میں ایک بوسیدہ ٹم ٹم اور دو تھانوں پر دو مریل سے گھوڑے جنھیں دیکھ کر ان کے مالکوں کے بارے میں صحیح رائے قائم کی جا سکتی ہے. اصطبل کے باقی حصے میں لینڈی کتے رہتے ہیں، محلے کی کتیاں بچے جنتی ہیں اور قصبے بھر کے جانور گرمی، برسات اور جاڑوں کی صعوبتوں سے بچنے کے لئے آکر پناہ لیتے ہیں.

اصطبل کے برابر ہاتھی کا کھلا ہوا تھان ہے، جہاں رام پیاری ہتھنی گنے کھایا کرتی تھی، جب وہ مری ہے تو اس کی لاش کلہاڑیوں سے کاٹی گئی تھی، اور گوشت اور ہڈیاں ٹکڑے ٹکڑے کر کے اٹھائی گئی تھیں، پرانے سماجوں کا جنازہ بھی اسی شان سے نکلتا ہے.

www.taemeernews.com

اور تھان کے سامنے جو تلپٹ کے ہرے پتّوں اور نیلے پھولوں سے ڈھکا ہوا تالاب ہے، اس کا پانی کبھی بڑا صاف شفّاف تھا، اور اپنی بڑی بڑی روہو مچھلیوں کے لئے مشہور تھا، اس کے کنارے امرودوں کا ایک باغ تھا، اور ایک کبڑی پیٹھ کا بوڑھا اور اس کی بیوہ بیٹی امرود بیچا کرتی تھی. پکنے سے پہلے گدّر امرود بک جاتے تھے. اب باغ اجڑ چکا ہے، اور ہاتھی کا تھان گھورے کے نیچے دب گیا ہے اور اکثر سبزی مائل نیلے کانٹے دار پودوں کے زرد زرد پھولوں میں دو چار گدھے کھڑے نظر آتے ہیں.

تھان کے پاس لگا ہوا برگد کا بوڑھا درخت اب بھی پھلتا ہے اور چڑیاں اس کے سُرخ رنگ کے پھلوں کو کُتر کُتر کر زمین پر پھینکتی رہتی ہیں اور اس کی ٹہنیوں پر لال چونچ کے طوطے ٹائیں ٹائیں کرتے رہتے ہیں. پریاں برگد کے پھول اب بھی چُرا لے جاتی ہیں. لیکن اب اس بات میں کوئی رومانی کیفیت باقی نہیں ہے. اس خیال میں کوئی حیرت کا لطف نہیں ہے، میں اپنے بچپن میں جب کبھی ان پریوں کا تصور کرتا تھا تو میری بڑی آپا اور ماں کے چہرے مسکرانے لگتے تھے اور میں اس بات کا کوئی جواب سوچ نہیں پاتا تھا کہ وہ برگد کے پھول کیوں چُرا لے جاتی ہیں. میری ماں اور بڑی آپا اب منوں خاک کے نیچے سو رہی ہیں اور برگد کے پیڑ کی موٹی موٹی، لمبی لمبی جٹائیں زمین میں اپنے لئے جڑیں تلاش کرنے شاخوں سے نیچے اتر آتی ہیں. بچپن کی پریاں کھو گئیں اور جن شاخوں سے پھولوں کا تصور وابستہ تھا وہ ہیبت ناک ہو گئی ہیں.

سڑک کی دوسری طرف سُرخ اینٹوں کی قدآدم دیوار کا ایک چوکور احاطہ ہے اس کے دو کونوں پر لوہے کے پھاٹک لگے ہوئے ہیں، جن کو کبھی سرخ بجری کی لہراتی ہوئی روش نے ایک دوسرے سے جوڑ رکھا تھا. اب چُولوں میں اتنا زنگ لگ چکا ہے کہ پھاٹکوں کا بند کرنا مشکل ہے، احاطے کے اندر ایک

www.taemeernews.com

ٹینس کورٹ تھا اور اس کے چاروں طرف ہری ہری دوب بچھی ہوئی تھی۔ عشق پیچاں کی بیلیں باریک تاروں پر پھیلی ہوئی تھیں، گلاب، بیلے اور چمپا کے پودے لگے ہوئے تھے اور مہندی کی باڑھ کھڑی تھی، جو بجری کی لال روش کے کنارے کنارے دوڑتی تھی۔ دو کونوں پر گل مہر کے دو پیڑ تھے جو اپنے پھولوں سے لد کر لال بھبھوکا ہو جاتے ہیں۔ ان سب کی حفاظت کے لئے دو مالی تھے جو ذرا سی کوتاہی پر پیٹ دیئے جاتے تھے۔ اگر غلطی سے اس باغ میں کوئی گائے بیل گھس آتے تو اسے پکڑ کر میونسپلٹی کے "کانجی ہوز" میں بند کر دیا جاتا تھا اور مالیوں پر اتنی گالیاں پڑتی تھیں کہ خدا کی پناہ۔ میں نے اپنے بچپن میں اس باغ سے بیشمار تتلیاں پکڑی ہیں اور گل مہر کی ہری ہری کلیوں سے فالیں نکالی ہیں۔

اب مہندی کی باڑھ، گلاب، بیلے اور چمپا کے پودے، عشق پیچاں کی سرخ پھولوں سے بھری ہوئی سبز بیلیں اور ہری ہری دوب، سب، سوکھ چکی ہے، باغ ایک میدان میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اور اب سانڈ وہاں آپس میں لڑتے ہیں، اور گدھے رینکتے ہیں۔ اور کھجیلے کتے اپنی پچھلی ٹانگوں میں اپنی دُم دباتے ہوئے ٹہلتے رہتے ہیں۔ گل مہر کے پیڑ اب بھی ہیں لیکن وہ بوڑھے ہو چکے ہیں اور ان میں پھول نہیں آتے، کبھی کبھی کوئی بھولی بھٹکی کلی جھانکتی ہے، ورنہ بس شاخوں کے سوکھے ہوئے ہاتھ ہوا میں پھیلے ہوتے ہیں۔ بھوکے بھکاریوں کے ہاتھوں کی طرح جنھیں کوئی بھیک نہیں دیتا۔ یہ خشک ہاتھ ٹھنڈی اور گرم ہواؤں سے خشک اور تر موسموں سے اپنی پتیوں اور پھولوں کی بھیک مانگتے مانگتے تھک جائیں گے اور پھر ایک ایک کر کے گرتے جائیں گے۔ انھوں نے شکست کھا جانے کے بعد بھی اب تک شکست کا اعتراف نہیں کیا... انھیں یہ خبر نہیں کہ جب جڑیں سوکھ جاتی ہیں تو شاخوں میں برگ و بار نہیں آتے، موسم بہار بھی ان کے لئے بہار کا پیغام نہیں لاتے گا۔ یہی ضد سماجی نظاموں میں تشدد کی پرورش

www.taemeernews.com

کرتی ہے

احاطے کے اندر بجری کی لال روش کے موڑ پر ایک اور بڑا پھاٹک ہے۔ اس کی محراب اتنی بلند ہے کہ اس کے نیچے سے ہاتھی گذر سکتا ہے، اس کے اندر اینٹوں کا بنا ہوا ایک بڑا صحن ہے، اور بیچ میں ایک چبوترے پر اس قصبے کا سب سے اونچا نیم کا درخت کھڑا ہوا ہے۔ اس کی عمر کوئی سو برس کے قریب ہوگی، اس کا سایہ اب بھی ٹھنڈا اور صحت بخش ہے، لیکن پھنگیوں پر چیلوں اور کوؤں نے گھونسلے بنا لیتے ہیں اور ان کی بیٹ نیم کے نیچے کسی کو نہیں بیٹھنے دیتی۔ پکی ہوئی خوشبودار نبولیاں سال میں ایک بار ٹپکتی ہیں۔ نیم کی ہری پتیاں سنہری ہو کر سال میں ایک بار ہواؤں میں اپنا سونا بکھیرتی ہیں، لیکن چیلوں اور کوؤں کی بیٹ بارہ مہینے ٹپکتی رہتی ہے۔

اس کے چاروں طرف کئی مکانات ہیں: ہر مکان میں ایک گھرانہ آباد تھا، انھیں میں ایک میرا گھر بھی تھا، بڑے سے صحن، وسیع دالان اور کوٹھے کی دو کھلی ہوئی چھتوں کا گھر۔ اس کی پورب کی دیوار کی طرف سے ایک مندر کا خوبصورت کلس اور شیشم کا ایک بلند قامت درخت اندر جھانکتا تھا۔ اور پیڑ کے پیچھے سے صبح کا سورج اور چودھویں کا چاند نکلتا تھا۔ گرمیوں کی راتوں میں جب پلنگ بچھ جاتے تھے تو یہ آنگن چھوٹا معلوم ہوتا تھا۔ اور جاڑوں کی راتوں میں اتنا لمبا کہ میں اکثر دوڑ کر اس آنگن سے گذرا کرتا تھا، اسی آنگن میں میں نے پہلی بار اپنی رگوں میں جوانی کا خون محسوس کیا۔ گرمی کی ایک تپتی ہوئی دوپہر میں دیوار کے سائے کے نیچے ایک چارپائی پر اس کا پسینے سے بھیگا ہوا چہرہ کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ وہ غافل سو رہی تھی۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے اس سے زیادہ حسین چیز نہیں دیکھی ہے۔ وہ چہرہ آج نظروں سے اوجھل ہو کر اور زیادہ خوبصورت ہو گیا ہے۔

www.taemeernews.com

اس سارے ساز و سامان میں جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ ہمارے چھوٹے سے گھر کے سوا اپنا اور کچھ نہیں تھا۔ ہر چیز ریاست کی تھی، جو میرے والد اور چچا کو ملازمت کے سلسلے میں استعمال کے لئے ملی تھی میرے چچا بڑے عہدے پر تھے اور والد چھوٹے عہدے پر۔ لیکن رعب پورے خاندان کا تھا، چچا سیّد صاحب کہلاتے تھے، اور والد بڑے بھیّا کے نام سے مشہور تھے، میری ماں کو سارا قصبہ بڑی بہو کہتا تھا۔

خاندان میں بڑا اطمینان تھا۔ بلرام پور سے باہر کی دنیا ہمارے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ یہیں بچے پیدا ہوتے تھے، جوان ہوتے تھے، بلرام پور کے اسکول کے بعد علی گڑھ میں تعلیم حاصل کرتے تھے اور پھر شادی ہو جاتی تھی اور ریاست میں ملازمت مل جاتی تھی۔

خاندان کی چھوٹی چھوٹی لڑائیاں کبھی کبھی ہوتی تھیں، ورنہ دن ہنسی خوشی گذر جاتا تھا، اور رات کو سب بھائی بہن بستروں پر لیٹ جاتے تھے کوئی ایک بہن شریک ہو مزکی کہانیاں راشد الخیری کے ناول یا عظیم بیگ چغتائی کی کوئی کتاب پڑھ کر سناتی، اس سے تھک جانے کے بعد جناتوں کے قصے شروع ہوتے جو انتہائی دلچسپ ہونے کے بعد بھی دل میں دہشت پیدا کر دیتے، میری ایک پھوپھی کو اصرار تھا کہ گھر میں جو کالا کتّا آتا ہے، وہ جن ہے اور اُسے انھوں نے بلّی اور گدھے میں تبدیل ہوتے دیکھا ہے۔

یہ بڑا ایمان دار، مذہب کا پابند اور پرہیزگار خاندان تھا، اسی لئے مجھے چھوٹی عمر میں سلطان المدارس لکھنؤ میں داخل کر دیا گیا کہ مولوی بن جاؤں گا، تو خاندان کی عاقبت سُدھر جائے گی، لیکن طبیعت کی آزادہ روی نے اس سعادت سے محروم کر دیا اور میں لکھنؤ سے تین بار بھاگا، میرے والد اور چچا نے کبھی رشوت نہیں لی، اور دولت مندی کی شہرت کے باوجود صبر و قناعت

www.taemeernews.com

کے ساتھ زندگی گذار دی۔ میری ماں کے سارے زیور بک گئے، لیکن کسی کو کانوں کان یہ خبر نہ ہوئی کہ گھر میں افلاس ہے۔ وہ بڑے خلوص سے ملازمت کرتے تھے اور ہر موقع پر نمک حلال ہونے کا ثبوت دیتے تھے۔ عام طور سے کالی ٹوپیاں پہنتے تھے جو نہ جانے کیوں ایرانی ٹوپیاں کہلاتی تھیں۔ لیکن دسہرے کے موقع پر جو ریاست میں بڑی دھوم سے منایا جاتا تھا، رنگین صافے باندھ کر جلوس کے ہاتھیوں پر بیٹھتے تھے، اور مہاراج اور مہارانی کو نذر دینے جاتے تھے، عید، بقرعید ۱۲ ربیع اور عید غدیر بڑی شان سے مناتے تھے اور دیوالی پر ریاست کے کام کے علاوہ ہمارے خاندان کو اخراجات کے لئے جو گاؤں ٹھیکے پر ملے تھے، ان کا انتظام کرتے تھے، اور سال بھر نمازیں پڑھتے تھے، روزے رکھتے تھے۔ شعبان کے مہینے میں بارہویں امام کا یوم ولادت مناتے اور عریضے ڈالنے جاتے تھے، اور محرّم بڑے جوش و خروش سے مناتے تھے۔ اپنے انتقال سے کچھ پہلے جب میرے والد بستر سے اٹھنے کے قابل نہیں تھے، تو ان کی چارپائی محرم کی مجلسوں کے لئے عزاخانے میں لاکر رکھ دی جاتی تھی اور وہ لیٹے لیٹے مجلس سنتے تھے۔

چاند رات کو عورتیں چوڑیاں توڑ دیتی تھیں اور زیور اتار کر رکھ دیتی تھیں، اور سب لوگ کالے کپڑے پہن لیتے تھے اور باہر کوٹھی کے سب سے بڑے کمرے میں ضریح رکھی جاتی تھی اور علم کھڑے کئے جاتے تھے۔ چھتوں میں جھاڑ فانوس لگائے جاتے تھے، چاندی اور سونے کے علم کے پنجے اور سنہری کام کے سبز، زرد، سرخ اور سیندوری ٹیکے مجھے بہت اچھے لگتے تھے۔ محرم کی ساتویں تاریخ کو مہندی اٹھتی تھی۔ اور مجھے علی بند پہنایا جاتا تھا، آٹھویں کو حضرت عباس کا علم نکلتا تھا اور شب عاشور اغرا خانہ سجا دیا جاتا تھا۔ اور فانوس جگمگا اٹھتے تھے، قصبے اور گردونواح کے گاؤں کے لوگ زیارت کرنے کے لئے ٹوٹ پڑتے تھے، عورتیں ٹولیاں بنا کر دیہاتی مرثیے گاتی ہوئی آتی تھیں اور حضرت صغریٰ

www.taemeernews.com

کے قاصد کے نام پر جوان لڑکے پیک بن کر آتے تھے، ان کی کمر میں ایک پٹکے کے ساتھ ایک گھنٹا بندھا ہوتا تھا، سر پر پگڑیوں میں مور کے پر لگے ہوتے تھے اور ہاتھوں میں مورچھل رہتے تھے۔ پیکوں کی ٹولیاں اپنے گھنٹے بجاتی ہوئی آتیں اور عزاخانے میں مرثیے گا گا کر ناچتی تھیں۔ ان کے قدم "حامی اللہ" کے بول پر اٹھتے تھے، دس دن مسلسل مجلسیں ہوتی تھیں اور پڑھنے کے لئے لکھنؤ سے ذاکر آتے تھے، عشرے کے دن سارے قصبے کی فاقہ کشائی ہمارے گھر ہوتی تھی۔

سال کے اور مہینوں میں بھی مجلسیں اور محفلیں ہوتی تھیں۔ جن کی بدولت میں نے اس عہد کے تمام بڑے ذاکروں کو سنا ہے۔ اور تمام بڑے علماء اور مجتہدین کے ہاتھوں کو بوسے دیئے ہیں۔ مولانا سبط حسن کی خطابت بے پناہ تھی، فصاحت اور بلاغت کا دریا موجیں مارتا تھا۔ اور اشاروں اور کنایوں کا تیکھا پن تڑپا دیتا تھا۔ دولہا صاحب کو میں نے اس عالم میں دیکھا کہ وہ منبر کے نیچے تقریباً دوہرے ہو کر بیٹھتے تھے، دو آدمیوں نے سہارا دے کر منبر پر بٹھا دیا۔ مرثیہ انھوں نے ہاتھ میں لیا۔ ایک بار سنبھلے اور پڑھنا شروع کیا تو دوسری ہی چیز ہو گئے ؎

نام مردوں کا رقم بارگہ پہ تلوار کی ہے

اس کے علاوہ انیسؔ کے مرثیوں کا چرچا بھی تھا۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ کلمہ اور تکبیر کے بعد شاید میرے کانوں نے پہلی آواز انیسؔ کی سنی ہے، میں شاید پانچ چھ برس کی عمر سے منبر پر بیٹھ کر سلام اور مرثیے پڑھنے لگا تھا، سلام اور مرثیے کے علاوہ ویسے بھی مجھے بے شمار اشعار یاد تھے۔

شاید اسی کا اثر تھا کہ میں نے پندرہ سولہ برس کی عمر میں خود مرثیے کہنے شروع کر دیئے تھے، اور مرثیوں کا اثر آج بھی میری شاعری پر باقی ہے، ان کی زبان تشبیہ، استعارے، ترتیب ہر چیز انیسؔ کی تھی۔ میرا اپنا کچھ نہیں تھا۔ میں ساٹھ ساٹھ،

www.taemeernews.com

ستر ستر بند لکھ جاتا تھا، لیکن مرثیہ ختم نہیں کر پاتا تھا۔ ویسے مجلس میں پڑھنے کے لئے یہ بند کافی تھے۔

جب میں نے پہلا مرثیہ کہا ؎

آتا ہے کون شمعِ امامت لئے ہوئے
اپنی جلو میں فوجِ صداقت لئے ہوئے

- - - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - - - -

اللہ رے حسن فاطمہ کے ماہتاب کا
ذرّوں میں چھپتا پھرتا ہے نورِ آفتاب کا

اور اسے منبر پر بیٹھ کر پڑھا تو والد اور چچا نے بہت گلے لگایا اور ماں نے سر پہ ہاتھ رکھ کر دعائیں دیں۔ میرے چچا بار بار مرثیے کے آخری دو مصرعوں کو پڑھتے تھے اور روتے تھے ؎

اکبر کو اپنے پہلوئے غم میں سلاؤں گی
اصغر کو اپنی گود میں جھولا جھلاؤں گی

اس کامیابی سے ہمت بہت بڑھی اور میں نے پندرہ بیس دن میں ایک مرثیہ اور کہہ لیا، وہ اس طرح شروع ہوتا تھا ؎

آتا ہے ابنِ فاتحِ خیبر جلال میں
ہلچل ہے شرق و غرب و جنوب و شمال میں
اک تہلکہ ہے وادی و دشت و جبال میں
بھاگا ہے آفتاب بھی برجِ زوال میں
کروٹ بدل رہی ہے زمیں درد و کرب سے
ہلتا ہے دشت گھوڑے کی ٹاپوں کی ضرب سے

www.taemeernews.com

مجھے اب تک یاد ہے کہ آخری مصرعے کے قافیے کی بہت داد ملی، لیکن کچھ لوگوں کو یہ بھی کہتے سنا کہ میں کسی سے لکھوا کر پڑھ دیتا ہوں۔ یہ بات مجھے اتنی ناگوار گذری کہ میں نے نیا مرثیہ ان مصرعوں سے شروع کیا ؂

اے بلبلِ ریاضِ بیاں نغمہ بار ہو
اے نوعروسِ طبع جواں ہم کنار ہو
اے خامۂ شگفتہ زباں لالہ کار ہو
اے حاسدِ دریدہ دہاں شرمسار ہو

کیا اس میں مجھ سے ہیچ مداں کا قصور ہے
یہ تو عطائے رحمتِ ربِّ غفور ہے

اس میں میں نے یہ بھی لکھا تھا :-

اک خوشہ چیں ہوں باغِ جنابِ انیس کا

پھر ایک اور مرثیہ کہا جس کے صرف دو مصرعے یاد رہ گئے ہیں ؂

عرش تک اوس کے قطروں کی چمک جانے لگی
چلی ٹھنڈی جو ہوا تاروں کو نیند آنے لگی

یہ مرثیے اب تک بلرام پور میں محفوظ ہیں اور محرم کی مجلسوں میں پڑھے جاتے ہیں۔

کربلا کے قافلے میں مجھے امام حسینؑ کے بعد سب سے زیادہ عقیدت حضرت عباسؓ اور حضرت زینبؓ سے تھی، اور انیس کے مرثیوں نے اس عقیدت پر جلا کر دی تھی۔

میرے والد کے پاس مذہبی کتابوں کا اچھا ذخیرہ تھا۔ قرآن بچپن میں بہار کے ایک مولوی صاحب سے پڑھا تھا، وہ دن میں بیدوں سے مارتے تھے، اور رات میں پیغمبروں کی کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ والد کی کتابوں سے میں نے تمام

www.taemeernews.com

پیغمبروں اور چودہ معصومین کے حالات پڑھ لئے تھے اور چونکہ میں اس عمر میں مرثیہ خوانی کے علاوہ حدیث خوانی بھی کرنے لگا تھا اس لئے وہ حالات اور قرآن کی بہت سی آیتیں زبانی یاد تھیں اور ان سب کا مجموعی اثر مجھ پر یہ تھا کہ حق اور صداقت کے لئے جان کی بازی لگا دینا انسانیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ میں نے حق اور صداقت کو ہمیشہ زمین کی چیز سمجھا۔ نمرود و خلیل کی داستان سے لے کر شہادت حسین تک کے واقعات نے میرے خون میں حرارت پیدا کر دی تھی، اور میں اقبال کے یہ اشعار لہک لہک کر پڑھا کرتا تھا ؎

آں امامِ عاشقاں پورِ بتول
سروِ آزادے ز بستانِ رسولؐ
اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر
معنیٔ ذبحِ عظیم آمد پسر
دشمنان چون ریگِ صحرا لاتعد
دوستان با لفظ یزدان ہم عدد
رمزِ قرآں از حسینؑ آموختیم
ز آتشِ او شعلہ ہا اندوختیم
ایں دو قوت از حیات آمد پدید
موسیٰؑ و فرعون و شبیر و یزید
شوکتِ شام و فر بغداد رفت
سطوتِ غرناطہ ہم از یاد رفت
تارِ ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز
تازہ از تکبیرِ او ایماں ہنوز

اس زمانے میں چند سوالات نے مجھے بے چین کیا اور چند سوالات نے میری

www.taemeernews.com

زندگی میں بہت بڑا انقلاب پیدا کر دیا۔ مجھے اس سوال نے کبھی پریشان نہیں کیا کہ یہ دنیا کیوں ہے اور کہاں سے آئی ہے۔ لیکن اس سوال نے ہمیشہ بے چین رکھا کہ یہ دنیا ایسی کیوں ہے، اور اس کی ابتدا میرے بچپن ہی میں ہو گئی تھی۔

میں نے ایشیائی افلاس کے بدترین نمونے دیکھے ہیں۔ ریاست کے گاؤں میں پہلے اور اپنے گھر میں بعد کو، مجھے شکار اور گھوڑے کی سواری کا بے انتہا شوق تھا اور میں بندوق لئے گاؤں گاؤں اور جنگل جنگل مارا پھرتا تھا، اور ریاست کی تحصیلوں اور ذیلداریوں میں ٹھہرتا تھا، اس طرح میں اودھ کے دیہات کی زندگی سے آشنا ہوا۔ یہ خوب صورت گیتوں، دھان اور گیہوں کے کھیتوں اور انتہائی افلاس کی سرزمین ہے۔ اس میں اتنی پگڈنڈیاں نہیں ہوں گی جتنے خون کے دھارے اس کے جسم میں جذب ہو چکے ہیں۔ میری یادیں اس کی انتہائی بھیانک تصویریں محفوظ ہیں۔ گرمیوں کی چلچلاتی ہوئی دھوپ میں جھکے ہوئے کسان جن کی پیٹھوں پر اینٹیں لدی ہوئی ہیں، ان کے جوتے مارے جا رہے ہیں۔ اور وہ دہائیاں دے رہے ہیں۔ پیڑ کی شاخوں میں بالوں سے لٹکی ہوئی عورتیں، پتلی پتلی سوکھی ہوئی ٹانگوں اور باہر نکلے ہوئے پیٹوں کے بچے۔ بڑی بڑی سیاہ مگر بجھی ہوئی آنکھیں، ایک بار میرے سامنے ایک کسان عورت ننگی کر دی گئی۔ یہ اور اس قسم کی بے شمار تصویریں ہیں جو اگر کوئی مصور پردے پر بنا دے تو دنیا چیخ اٹھے۔ ان دیہاتوں میں جا کر مجھے پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ لاکھوں آدمی چوبیس گھنٹے میں صرف ایک بار کھانا کھاتے ہیں۔

اودھ کی دوسری تعلقہ داریوں کی طرح بلرام پور میں بھی ہرواہی کا رواج تھا۔

خود ہمارے گاؤں میں ہرواہے اور ہرواہیاں تھیں۔ ان کے پاس اپنی زمین اور اپنا گھر نہیں ہوتا تھا۔ یہ زمینداروں اور ٹھیکیداروں کے کھیتوں پر

www.taemeernews.com

کام کرتے تھے اور فصل کٹنے کے بعد موٹے اناج کی شکل میں ان کو مزدوری دیجاتی تھی جس سے ان کا پیٹ نہیں بھرتا تھا۔ اور یہ قرض لینے پر مجبور ہوتے تھے، جسے نہ وہ خود زندگی بھر ادا کر سکتے تھے نہ ان کی آنے والی نسلیں، اس لئے ان کی نسلوں کی نسلیں زمینداروں اور ٹھیکیداروں کے کھیتوں کے ساتھ بندھی ہوتی تھیں، وہ ایک طرح کے نیم غلام تھے۔ اور ان کی جان اور مال اور عزت و آبرو پر زمیندار کا پورا پورا حق تھا، ان سے زیادہ تباہ حال مخلوق میں نے کبھی نہیں دیکھی ہے، یہ مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ اس ہرواہی کے عذاب سے بچنے کے لئے یہ لوگ بمبئی، اور کلکتہ کے شہروں کی طرف بھاگتے ہیں۔ کیونکہ اودھ کے کسی ضلع یا گاؤں میں ان کے لئے پناہ لینا ناممکن تھا، قدیم عہد کے غلاموں کی طرح یہ اپنے مالک کی ملکیت تھے، اور دوسرا مالک انھیں زبردستی پکڑ کر واپس کر دیتا تھا۔

ایک بار ایک ہرواہی ہمارے گھر میں اناج صاف کرنے آئی تھی۔ وہ چاول صاف کرتی جاتی تھی، اور ایک مٹھی کچے چاول اپنے منہ میں ڈال لیتی تھی، یکایک میرے بہنوئی کی نظر پڑ گئی، انھوں نے ڈانٹ کر پوچھا کہ منہ میں کیا ہے۔ ہرواہی گھبرا کر جلدی جلدی کچے چاول چبانے لگی، میرے بہنوئی نے لپک کر اس کے منہ پر ایک گھونسہ مارا، ہرواہی نے خون کی ایک کلی کے ساتھ کچے چاول تھوک دیئے۔ وہ غریب کئی دن کی بھوکی تھی۔

افلاس کچھ ضحکہ خیز تصویریں بھی بناتا ہے، لیکن وہ حقیقتاً بڑی دردناک ہوتی ہیں۔ مجھے اپنے اسکول ماسٹروں کی یاد اسی طرح آتی ہے۔ ان میں ایک منشی بدری پرشاد چھوٹے سے قد کے بوڑھے آدمی تھے۔ دھوتی باندھتے تھے اور ایک میلا سا کوٹ پہنے رہتے تھے۔ مشین سے کٹے ہوئے خشخاشی بالوں کے سر پر فیلٹ کی کالے رنگ کی میلی چیکٹ ٹوپی چھوٹے سے تنگ ماتھے پر جھکی رہتی تھی، گردن کوتاہ تھی اور کندھے اوپر کو اٹھے رہتے تھے، اور وہ چلتے بھی تھے ذرا جھک کے،

www.taemeernews.com

تیسرے سے چھٹے درجے تک حساب پڑھاتے تھے، اور بیچ بیچ میں کھنکارتے جاتے تھے، منشی جی اپنی چھوٹی سی پرانے فریم کی عینک لگا کر حاضری لینے اور پھر پڑھانے کھڑے ہو جاتے، پھر سوال پوچھتے، جو بچہ سوال کا ٹھیک جواب نہ دے پاتا، اس کی شامت آجاتی۔ تین چار بید مارنے کے بعد منشی جی کھنکھارتے، اور طالب علم کے دماغ کو کمزور قرار دے کر اسے تیل لگانے کی ہدایت دیتے، تاکہ دماغ روشن ہو جائے اور حافظہ تیز ہو جائے، اور حساب سیکھنے میں کوئی مشکل نہ پیش آئے، یہ کہتے کہتے وہ جیب سے تیل کی شیشی نکال لیتے اور طالب علم کے ہاتھ بیچ دیتے، معلوم نہیں وہ یہ تیل خود بناتے تھے، یا خرید کر لاتے تھے، ایک بار میں نے بھی ان کا تیل خریدا، اور اس یقین کے ساتھ سر میں لگا لیا کہ اس کی ہر بوند سے دماغ اس طرح روشن ہو جائے گا جیسے مٹی کے تیل سے لالٹین جل اٹھتی ہے لیکن صبح روشن دماغ کے سلسلے میں اپنی ماں کا یہ فقرہ سنا کہ چھچھوندر کی بو کہاں سے آرہی ہے۔

آج منشی بدری پرشاد کا خیال آتا ہے تو مجھے ان پر بے انتہا پیار آنے لگتا ہے، حالانکہ بچپن میں ان کے بید کھا کر میں نے بھی دوسرے لڑکوں کی طرح درختوں کے پیچھے چھپ کر ان پر آوازیں لگائی ہیں۔ لیکن منشی جی نے کبھی لڑکوں کے فقروں پر مڑ کر نہیں دیکھا۔ گردن جھکائے آتے تھے اور گردن جھکائے چلے جاتے تھے، میں کبھی ان کے گھر نہیں گیا، مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کی زندگی میں کیسی کیسی ناکامیاں اور حسرتیں تھیں۔ شاید خواہشوں کا گلا وہ بہت پہلے گھونٹ چکے ہوں گے۔ اور تیل صرف اس لئے بیچتے ہوں گے کہ ان کی قلیل سی تنخواہ ان کے لئے ناکافی ہوگی اور ان کی دال گھی سے محروم رہتی ہوگی۔ اب اگر مجھے منشی بدری پرشاد مل جائیں تو میں ان کے پیر چھو کر اپنی گستاخیوں کی معافی مانگوں، جن کا غالباً انھیں علم بھی نہ ہوگا، اور ان کی تیل کی شیشیاں خریدنے کے لئے تمام عمر ان سے بید کھاتا رہوں اور اُف بھی نہ کروں،

www.taemeernews.com

ایک میرتق چوں چوں تھے جن کے ہاتھ پیر کو لقوے نے بے کار کر دیا تھا، لوگ انھیں چوتی چپت کہہ کر چڑھاتے تھے۔ ان کا منہ کالا کیا گیا، انھیں گدھے پر بٹھایا گیا۔ اور ایک بوڑھی مہترانی سے ان کی فرضی شادی رچادی گئی۔ اور یہ سب صرف اس جرم میں کہ وہ بے بس اور اپاہج تھے۔ اور ابھی اس قسم کے درجنوں کردار ہیں۔ سب ٹوٹے پھوٹے چہروں کے لوگ لیکن دکھی دلوں کے مالک۔

میں سوچتا تھا یہ مخلوق کہاں سے آتی ہے۔ یہ مظالم کیوں ہو رہے ہیں ان پر کوئی احتجاج کیوں نہیں کرتا، میرا خاندان اس پر قانع تھا کہ سب کچھ خدا کی دین ہے، امیر اور غریب ہمیشہ سے ہیں۔ ظلم و استبداد ہمیشہ سے ہے۔

اسی زمانے میں مجھے پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ اسلام میں زمین کی ملکیت کا کوئی تصور نہیں تھا، اور میں نے پہلی بار اپنے والد اور چچا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور مجھے پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ سماجی زندگی اور ذاتی عقائد کی زندگی کے درمیان ایک اونچی دیوار ہے۔ اور جو سوالات مجھے پریشان کر رہے ہیں وہ دوسروں کو پریشان نہیں کرتے۔ میں نے قرآن اور حدیث کی مدد سے استدلال کرنے کی کوشش کی۔ "خدا کے دیئے ہوتے رزق سے کھاؤ، پیو اور زمین پر فتنہ و فساد برپا نہ کرو۔" اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ فتنہ و فساد برپا کرنے والے صاحبان اقتدار ہیں جن کے ملازم میرے والد اور چچا ہیں، جنھیں اس کا اندازہ نہیں کہ وہ خود کتنے پسے اور دبے ہوئے ہیں۔ لیکن عام تصور یہ تھا کہ فتنہ و فساد کے ذمے دار کسان ہیں، اگر وہ بیگار سے انکار نہ کریں اور لگان ادا کریں اور موٹا جھوٹا پہن کر اور آدھے پیٹ کھا کر خدا کا شکر کیا کریں تو کوئی ہنگامہ نہیں ہوگا،

مجھے سن یاد نہیں ہے، لیکن ایک مرتبہ یہ ہوا کہ ایک گاؤں کے کسانوں نے بغاوت کر دی، ریاست کی فوج نے جواب میں سارے گاؤں میں آگ لگادی اور کسان عورتوں کو بے عزت کیا، اس پر بڑا ہنگامہ ہوا، اخباروں میں خبریں چھپیں،

www.taemeernews.com

اور کانگریس کی طرف سے پنڈت جواہر لال نہرو اس معاملہ کی تحقیقات کرنے آئے، ریاست کے عملے نے ان کو گاؤں تک جانے سے روک دیا، اور راستے کی کچّی سڑک میں جا بجا گڈھے کھود دیئے گئے، تاکہ پنڈت نہرو کی کار وہاں تک نہ پہنچ سکے۔

غالباً عید غدیر کا دن تھا، یا یوں ہی ہمارے گھر میں کوئی محفل تھی، میں اس محفل میں قصیدہ پڑھنے کے بجائے اس عام جلسے میں چلا گیا جہاں پنڈت نہرو نے جاگیرداری ظلم و استبداد کے خلاف تقریر کی۔ جلسے کے بعد میں واپس آیا تو گھر کے لوگ مجھ سے خفا تھے، اور میں ساری کائنات سے بیزار ظلم اور افلاس کے سماجی اسباب کے پہلے علم نے میرے دل میں چراغ جلا دیئے تھے۔

اسی زمانے میں میں نے دو نہایت اہم کتابیں پڑھیں، جنھوں نے میری زندگی بالکل پلٹ کر رکھ دی، ایک مہاتما گاندھی کی کتاب "تلاش حق" اور دوسری پلوٹارک کی کتاب "مشاہیر یونان و روما"۔ گاندھی جی کی کتاب میں پوری طرح نہ سمجھ سکا، اس لئے کہ وہ انگریزی میں تھی، اور میری انگریزی کی استعداد اتنی نہیں تھی۔ کتاب میرے چچا کی تھی، جنھوں نے خود اسے بڑے شوق سے پڑھا تھا، لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ان سے اس کے مطالب دریافت کروں، خود ہی اس کی سیاہ چھپی ہوئی سطروں میں نور اور روشنی کی جستجو کرتا رہا، پلوٹارک کی کتاب انجمن ترقی اردو اورنگ آباد نے چھاپی تھی اور غالباً اس کا اردو ترجمہ ہاشمی فرید آبادی نے کیا تھا، اس کا اثر زیادہ گہرا پڑا، کیوں کہ میں اسے آسانی سے سمجھ سکتا تھا، خاص طور سے لے کرگس نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ اب یہ بتانا مشکل ہے کہ اس کی کون سی ادا مجھے بھائی تھی۔

لیکن ان کتابوں نے میرے سوالات حل کرنے کے بجائے میرے دل میں اور آگ لگا دی۔ اس آگ کو کون بجھاتے، نہ گھر میں کوئی میرا جواب دینے والا

www.taemeernews.com

ہے اور نہ اسکول میں۔ نہ کتابیں نہ رسالے نہ اخبار، میرے والد اور چچا مجھ سے بہت محبت کرتے تھے، اس لئے ان کو میرے سوالات دیوانگی معلوم ہوتے تھے' ان کی شفقت میرے دل کی آگ کو نہیں بجھا سکی۔ ایک واقعے نے اس آگ کو اور بھڑکا دیا۔ ایک اور گاؤں میں بغاوت ہوگئی اور کسانوں نے ریاست کے تحصیلدار کو جان سے مار دیا، میرے بہنوئی جو ذیلدار تھے بہ مشکل اپنی جان بچا کر بھاگ آئے۔ سب کی ہمدردیاں میرے بہنوئی اور مرے ہوئے تحصیلدار کے ساتھ تھیں، میری ہمدردیاں کسانوں کے ساتھ۔

اب مجھے ہر اس چیز سے نفرت ہوگئی، جس سے امارت کی ذرا سی بھی بو آتی ہو، میرا ردِّ عمل صرف جذباتی تھا، اور عقل کو جذبات کی تنظیم کا راستہ نہیں مل رہا تھا' اس عالم میں میں نے ایک نظم کہی کہ خدا نہ تو غرناطہ و بغداد کے ایوانوں میں ہے، نہ امیروں کے محلوں میں، خدا جو کی روٹی میں ہے، پیوندوں کی چادر میں ہے' اور کربلا میں چمکنے والی حسینؑ ابن علی کی تلوار میں۔ اب اس کا ایک مصرعہ بھی یاد نہیں ہے، لیکن یہ نظم میں نے کئی مجلسوں میں پڑھی اور اس کی داد بھی ملی، اور تو کسی نے اس نظم کو نہیں سمجھا، لیکن والد اور چچا کے ملنے والے ایک گورنمنٹ کے تحصیلدار التجا حسین صاحب تھے، وہ مجھے بہت پیار کرتے تھے، ان کے کان کھڑے ہوگئے، انھوں نے نظم کی تعریف کی، اور پھر مجھ سے پوچھا "تم خدا کو مانتے ہو"۔ وہ مجھے اسی طرف لے جانا چاہتے تھے کہ امیر و غریب سب خدا کے بنائے ہوئے ہیں۔ لیکن گفتگو میں بات یہاں آ پہونچی کہ میں نے کہا کہ "میں خدا کو اس لئے مانتا ہوں کہ رسولؐ کو مانتا ہوں"۔ بزرگوں کی تیوریوں پر بل پڑ گئے اور انھوں نے مجھے گھور کر دیکھا، لیکن میں اس وقت ان کے سامنے گستاخ ہوگیا تھا، یہاں تک کہہ گیا کہ "آپ کے پاس خدا کے ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ لیکن میرے پاس ہے اور وہ یہ کہ رسولؐ نے کہا ہے کہ خدا ہے"۔ میں وہاں سے اٹھ کر چلا آیا اور دیر

www.taemeernews.com

تک اقبال کی بانگ درا پڑھتا رہا اور جب شکوہ کے اس بند پر پہونچا ؎

تھی تو موجود ازل ہی سے تری ذاتِ قدیم
پھول تھا زیبِ چمن پر نہ پریشاں تھی شمیم
شرطِ انصاف ہے اے صاحبِ الطافِ عمیم
بوئے گل پھیلتی کس طرح جو ہوتی نہ نسیم
ہم کو جمعیتِ خاطر یہ پریشانی تھی
ورنہ امّت ترے محبوب کی دیوانی تھی

تو خوشی سے میری باچھیں کھل گئیں، کہ میں اپنے بزرگوں کے سامنے اقبال کی دلیل پیش کرکے آیا ہوں۔

اب خاندان میں میرا تھوڑا سا احترام بھی کیا جاتا تھا اور لوگ میرے نام پر زیرِ لب مسکرا بھی دیتے تھے۔

میں نے اچھی چیزیں کھانا چھوڑ دی تھیں، ٹینس کھیلنا اور شکار کھیلنا بھی تقریباً ترک کر دیا تھا، زیادہ تر کتابیں پڑھنے میں وقت گذارتا تھا، لیکن کام کی کتابیں کم تھیں، سب سے اچھی کتاب بانگ درا تھی، جو زبانی یاد ہو گئی تھی، اسی دوران میں نگار کے کچھ پرانے پرچے کہیں سے مل گئے۔ غالباً ۱۹۲۴ء کی فائلیں تھیں، ان میں پہلی بار غالباً نیاز فتحپوری کی کسی تحریر میں انقلاب روس کا ذکر مل گیا، اور میں نے اقبال کی خضرِ راہ کو اس کے ساتھ ملا کر اپنے خوابوں کی نئی دنیا تعمیر کرنا شروع کر دی۔

ماں باپ میری حالت پر کڑھتے تھے، اور بہنیں مجھے حیرت سے دیکھتی تھیں، ایک رشتہ کی بہن تھی، اس کی آنکھوں میں حیرت سے زیادہ پسندیدگی کی چمک تھی، اور یہ چمک مجھ کو اس پر آمادہ کر دیتی تھی کہ میں اس کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار کروں، میں اس سے ہمیشہ مفلسی اور امارت، ظلم اور انصاف کی باتیں کرتا

www.taemeernews.com

رہتا تھا، لیکن کچھ عرصے بعد معلوم ہوا کہ ہمارے درمیان کچھ نازک اور لطیف شئے پیدا ہو گئے ہیں، اور میرے دل میں ایک نور سا بکھر گیا۔ برسوں بعد جب میری شادی کا سوال اٹھا تو میں نے اپنے والدین کو اس لڑکی کا نام بتا دیا۔ لیکن لڑکی کے باپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں اول جلول آوارہ گرد ٹھہرا نہ رہنے کا ٹھکانا ہوگا، نہ کھانے کا، لڑکی کہاں بھاڑ جھونکے گی۔

یہ غالباً ۱۹۳۰ء کے آس پاس کی بات ہے کہ میں نے طے کر لیا کہ میں بلرام پور سے نکل جاؤں گا۔ اتفاق سے یہ خبر معلوم ہوئی کہ جہاز رانی کی ٹریننگ کے لئے اب ہندوستانی بھی لئے جائیں گے۔ کچھ ذوق آوارہ گردی، کچھ بلرام پور سے نکل جانے کا شوق، میں نے اپنے والد سے جہاز رانی میں جانے کی خواہش ظاہر کی۔ انھوں نے اجازت دیدی، میں مہینوں امتحان کی تیاری کرتا رہا، اور پھر لکھنؤ جا کر امتحان دیا اور اس میں کامیاب ہو گیا، بمبئی سے بلاوا آ گیا، میں بے انتہا خوش تھا، اور سفر کی تیاریاں کرنے لگا تھا کہ یکایک ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے سارے خوابوں کو خاک میں ملا دیا۔

ایک مجتہد صاحب ہر سال تشریف لاتے تھے، میں جانے کی تیاری میں تھا کہ وہ آ گئے۔ جب میرے والد نے ان کے سامنے ذکر کیا تو کچھ شبہات کا اظہار بھی ہوا، کس طرف سے؟ یہ مجھے نہیں معلوم۔ بس اتنا معلوم ہے کہ مجھے ان کے سامنے بلایا گیا، اور پھر میرے سامنے استخارہ دیکھا گیا اور استخارہ منع آ گیا، میں نے اس وقت ذرا سی جھنجھلاہٹ محسوس کی پھر یہ تاویل کی چلو اچھا ہوا۔ میں خواہ مخواہ انگریزوں کی ملازمت کرنے جا رہا تھا، لیکن جب ۱۹۴۶ء میں میری آنکھوں کے سامنے بمبئی کے جہازیوں نے بغاوت کی تو میرا دل اس خیال سے تڑپ اٹھا کہ میں اس بغاوت میں شریک نہ ہو سکا، اسے ایک طرح کی رومانیت کہہ لیجئے، لیکن یہی رومانیت تو زندگی میں رس پیدا کرتی ہے۔

www.taemeernews.com

اب پھر بلرام پور کا کنواں تھا اور میں، عمل کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا، ذہنی الجھنیں بڑھتی جارہی تھیں، میں بے بس تھا، اور اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

اس ذہنی کیفیت میں میں ۱۹۳۳ء میں علی گڈھ پہونچا، اس وقت میری عمر بیس برس کی تھی، چونکہ میں نے ابتدائی چند سال عربی اور فارسی کی تعلیم میں گذارے تھے اور تب انگریزی اسکول میں داخلہ لیا تھا، اس لئے میں اپنی عمر کے اعتبار سے تعلیم میں پچھڑا ہوا تھا۔ جب انٹرمیڈیٹ میں پہونچا تو میرے ہم عمر بی، اے اور ایم اے کے طالب علم تھے۔

یہ زمانہ جتنا ہندوستان کی تاریخ میں اہم ہے اتنا ہی اردو ادب اور علی گڈھ کی تاریخ میں بھی۔ علی گڈھ تحریک نے انیسویں صدی میں اردو ادب کے دھارے کو موڑا تھا، بیسویں صدی کی ابتدا میں غزل کی اصلاح کا سہرا بھی علی گڈھ ہی کے ایک سپوت مولانا حسرت موہانی کے سر ہے۔ تیسری دہائی میں وہاں کی رومانی تحریک میں بھی علی گڈھ کا اچھا خاصہ حصّہ ہے، اور تیسری دہائی میں جب ترقی پسند تحریک نے اردو ادب کو نیا رخ دیا تو یہاں بھی علی گڈھ پیچھے نہیں رہا۔

جس زمانے میں میں وہاں پہونچا نئی تحریک کے اولین نقوش بن رہے تھے، اور ادب اور سیاست مل کر ایک ہوئے جارہے تھے، اختر رائے پوری، سبط حسن، حیات اللہ انصاری، سعادت حسن منٹو، مجاز، جاں نثار اختر، آل احمد سرور سب وہاں کے طالب علم تھے، ڈاکٹر اشرف اور ڈاکٹر عبدالعلیم استادوں میں تھے، بعد کو عصمت چغتائی بھی وہاں پہونچ گئیں اور جذبی بھی۔ اور یہ سب جدید اردو ادب کے نہایت اہم اور ہوش مند معمار ہیں۔

میں جس ذہنی کیفیت میں گیا تھا اس کا تقاضا یہ تھا کہ میں سیدھا لائبریری کا رخ کروں، مجھے معلوم بھی نہیں تھا کہ علی گڈھ میں کون کون ہے، اور کس قسم کے طوفان

www.taemeernews.com

پرورش پا رہے ہیں۔ میں اس نتیجے پر پہونچ گیا تھا کہ ذہنی الجھنوں کو دور کرنے کے لئے علم بہت ضروری ہے۔ جس سے میں اب تک بری طرح محروم تھا۔

بغیر کسی ترتیب کے میرا ہاتھ جس کتاب پر پڑا اسے پڑھ ڈالا، لیکن نہ جانے کیوں میرا ہاتھ کسی سیاسی کتاب پر نہیں پڑا۔ عام طور سے میں ادبی کتابیں پڑھ رہا تھا، ان کے زیر اثر بلرام پور میں پیدا ہونے والے سوالات کچھ عرصے کے لئے دب گئے، اور میں آسکر وائیلڈ میں کھو گیا، جس کی سالومی کے زیر اثر میں نے نہایت بے سرو پا ڈرامہ لکھا، غالباً اس کا نام "دیوانے" تھا، اور وہ علی گڈھ میگزین میں شائع ہوا تھا اس کی نہ جانے کیوں میرے محترم استاد رشید صدیقی صاحب نے تعریف کی، اور بھی کچھ لوگوں نے اسے سراہا۔ میں اس وقت تو خوش ہوا، اور جب ذرا ہوش آیا، تو حیران ہو گیا، اور آج بھی حیران ہوں۔ کیوں کہ اس پر کسی قسم کے سیاسی اور سماجی شعور کی پرچھائیں بھی نہیں ہے۔ صرف لفاظی ہے، اور وہ بھی انتہائی مصنوعی۔ وہ تو حیرت ہوئی کہ چند سال بعد رشید صاحب نے اپنی کتاب مجھے دستخط کر کے دی، اور اس پر میرے لئے یہ لکھا کہ "جن کے بارے میں میری وہی رائے ہے جو میر کی غالب کے بارے میں تھی"۔ اس پر میں چونکا اور مجھے "دیوانے" کے مہمل ہونے کا یقین آ گیا، غالب کی منزل تو نصیب نہیں ہوئی لیکن ہوش ضرور آ گیا۔

لیکن میں آسکر وائیلڈ کی گرفت سے بہت پہلے نکل چکا تھا، جس زمانے میں میں اس کی سوانح عمری پڑھ رہا تھا تو گوئٹے کا "ورتھر" میرے ہاتھ لگ گیا۔ اس سے میں گوئٹے کی طرف مائل ہوا اور جب میں نے اس کا شاہکار فاؤسٹ پڑھا تو مجھے ادب کی حقیقی بلندی اور عظمت کا احساس ہوا۔

دل میں سوئے ہوئے سوالات پھر جاگنے لگے اور ایک روز محض اتفاق سے ایک واقعے نے مجھے نئی راہ پر ڈال دیا، تقریریں کرنے کا مجھے بھی شوق تھا اور میرے دوست فرحت اللہ انصاری کو بھی۔ وہ چونکہ انگریزی میں تقریریں کرتے تھے اور وہ

www.taemeernews.com

زمانہ یورپ میں فاشزم کے عروج کا زمانہ تھا، اور ہندوستان میں تحریک آزادی کی لہریں اونچی اٹھ رہی تھیں، اس لئے احمد عباس کی تقریروں کی طرح ان کی تقریروں میں بھی سیاسی الفاظ کی بہتات ہوتی تھی۔ ایک دن میں نے فرحت کی زبان سے یورژوا کا لفظ سنا اور ان سے اس کے معنی پوچھے: جواب دینے کے بجائے وہ ہنسنے لگے، میں پھر لائبریری کی طرف بھاگا، اور اس بار جب میں واپس آیا تو میری بغل میں لینن کی سوانح عمری تھی۔ مجھے اب یہ بالکل یاد نہیں ہے کہ وہ کس کی لکھی ہوئی تھی، بس اتنا یاد ہے کہ جو دروازے گاندھی جی کی کتاب پڑھ کر اور نہرو کی تقریر سن کر ذرا ذرا سے کھلے تھے اور پھر بند ہو گئے تھے، اس بار پورے کھل گئے۔ اور مجھے پیڑوں میں لٹکی ہوئی کسان عورتوں کو نیچے اتار کر ان کا کھویا ہوا وقار واپس دینے کا طریقہ معلوم ہو گیا۔ میں فرحت کا شکر گذار ہوں کہ ان کی ایک ہنسی نے کتنے ہونٹوں کی کھوئی ہوئی ہنسی واپس دلا دی۔

اسی زمانے میں مجاز سے ملاقات ہوئی۔ وہ ہنس مکھ اور تندرست تھا اور اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ دہانہ تب بھی بہت کم کھلتا تھا، لیکن ترنم کا جادو اپنے شباب پر تھا، (مجھے یاد ہے ۱۹۳۶ء کی ایک شام مجاز رشید جہاں کے گھر پر اپنی کوئی نظم سنا رہا تھا، محمود الظفر اور شوکت عمر اور خواجہ منظور حسین بھی وہاں تھے، دو بچیاں بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک بچی نے کچھ کہا تو دوسری بچی نے یہ کہہ کر اسے خاموش کر دیا چپ رہو باجا بج رہا ہے) مجھے معلوم بھی نہیں تھا کہ مجاز شاعر ہیں۔ ہم دونوں ایک ہی کورٹ پر ٹینس کھیلتے تھے، ایک روز مجاز کھیل کر واپس جا رہا تھا کہ اس کی پتلون تار میں الجھ کر پھٹ گئی، غوث محمد نے ہنس کر کہا شاعر صاحب کی پتلون پھٹ گئی، اور میں نے مڑ کر دیکھا کہ یہ کون شاعر ہے۔ اسی رات کو یونین کے مشاعرے میں مجاز سے پہلی بار ملاقات ہوئی۔ اس کی نظم اور ترنم دونوں میں جادو تھا۔ نظم "انقلاب" تھی اور اس کے ہر مصرعے میں مجھے اپنے دل کی دھڑکن محسوس

www.taemeernews.com

ہوئی. اس دن سے ہم دونوں دوست ہو گئے۔ یہ دوستی بائیس برس تک اتنی ہی بےلوث اور خوبصورت رہی جتنی پہلے دن تھی۔

اس مشاعرے میں میں نے اپنی نظم "سماج" پڑھی تھی جو ان شعروں پر ختم ہوتی تھی ؎

تمناؤں میں کب تک زندگی الجھائی جائے گی
کھلونے دے کے کب تک مفلسی بہلائی جائے گی
نیا چشمہ ہے پتھر کے شگافوں سے ابلنے کو
زمانہ کس قدر بے تاب ہے کروٹ بدلنے کو

جب میں مشاعرے کے بعد باہر نکلا تو ایک انتہائی ذہین آنکھوں اور بیمار چہرے کا طالب علم مجھے اپنے کمرے میں یہ کہہ کر لے گیا کہ "میں انقلابی ہوں" اس کے کمرے میں وکٹر ہیوگو کی بڑی سی تصویر لگی ہوئی تھی اور میز پر چند دوستوں کے ساتھ اس کی اپنی تصویر تھی، جس کی پشت پر گورکی کا ایک اقتباس لکھا ہوا تھا۔ یہ سعادت حسن منٹو تھا، اس نے مجھے بھگت سنگھ پر مضامین پڑھنے کے لئے دیئے۔ اور وکٹر ہیوگو اور گورکی سے آشنا کیا، میں جب اپنی تعلیم ختم کر کے لکھنؤ چلا گیا اور منٹو بمبئی تو اس نے مجھے کئی بار بمبئی بلایا۔ جب میں کمیونسٹ پارٹی کے ہفتہ وار اخبار میں کام کرنے کے لئے ۱۹۴۲ء میں بمبئی پہونچا تو میرے اور منٹو کے درمیان ادبی اختلافات کی خلیج بہت وسیع ہو چکی تھی، لیکن ہماری ذاتی دوستی میں فرق نہیں آیا۔ ویسے تلخ لمحات بھی آئے، اور تیز و تند کیفیت بھی پیدا ہوئی۔ اس رات منٹو بڑی دیر تک باتیں کرتا رہا اور ہم دونوں نے مل کر ایک رسالہ نکالنے کی اسکیم تیار کی۔ شاہد لطیف نے اس کا نام "نیا ادب" تجویز کیا، یہ رسالہ پانچ چھ برس بعد لکھنؤ سے نکلا، لیکن منٹو اور شاہد لطیف کے بجائے مجاز اور سبط حسن میرے ساتھ تھے۔

---

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

لکھنؤ کی پانچ راتیں

پہلی رات

راج سنگھاسن ڈانواڈول

لکھنؤ کی فضا میں ایک نئی آزادی کا احساس تھا، ۱۹۳۷ء میں کانگریس کی پہلی وزارت بنی تھی۔ کھدر کے کپڑوں کی وقعت بڑھ گئی تھی، ہم لوگوں نے اپنے سروں کی گاندھی ٹوپی کو اور زیادہ ترچھا کرلیا تھا۔

جب میں ۱۹۳۸ء میں دہلی سے لکھنؤ آیا تو مجاز وہاں پہلے سے موجود تھے، ان کے والد نے ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد لکھنؤ میں گھر بنایا تھا، مجاز کے چھوٹے بھائی انصار ہاروانی جواب پارلیمنٹ کے ممبر ہیں نیشنل ہیرالڈ میں کام کرتے تھے، وہاں کئی اور بھی احباب تھے، انور جمال قدوائی، سبط حسن، فرحت اللہ انصاری، علی جواد زیدی وغیرہ۔ حیات اللہ انصاری ہفتہ وار ہندوستان کے ایڈیٹر تھے۔ یش پال ہندی اور اُردو میں الگ الگ اپنا رسالہ و پلو شائع کرتے تھے۔

روز بروز ترقی پسندوں کا حلقہ وسیع ہوتا جاتا تھا۔ ڈاکٹر علیم اور احمد علی لکھنؤ یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے۔ ڈاکٹر رشید جہاں جنھیں ہم سب پیار سے رشید آپا کہتے تھے، ڈاکٹری کرتی تھیں، افسانے لکھتی تھیں، اور تمام نوعمر ادیبوں کے ساتھ

www.taemeernews.com

شفقت سے پیش آتی تھیں، کبھی کبھی الہ آباد سے سجاد ظہیر، ڈاکٹر اشرف اور ڈاکٹر احمد آجاتے تھے۔ جو پنڈت نہرو کی سرپرستی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے آفس میں کام کر رہے تھے۔ کانپور میں دو ایک انگریز ترقی پسند پروفیسر تھے۔ وہ بھی لکھنؤ کے چکر لگاتے رہتے تھے۔ اسی سال ڈاکٹر ملک راج آنند ترقی پسند مصنفین کی دوسری کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے (جس کا افتتاح ٹیگور نے کیا) انگلستان سے آتے تھے، ان کی زبان پر اسپین کا ذکر تھا، جس کے انقلابی کارنامے پہلے ہی ہم تک پہونچ چکے تھے، لاپشناریا اور لورکے نام فضاؤں میں گونج رہے تھے، ایک سال بعد ۱۹۳۹ء میں جذبی بھی لکھنؤ آتے اور جوش ملیح آبادی بھی۔ ان کا رسالہ "کلیم" اب نیا ادب میں ضم ہوگیا، اور وہ ایک طرح سے ہمارے ادبی سرپرست بن گئے (اسی زمانے میں سکندر علی وجد بھی لکھنؤ آگئے۔ وہ نظام سرکار کا سول سروس کا امتحان دے کر ٹریننگ لینے لکھنؤ آتے تھے، اس لئے آوارہ گردوں اور چاک گریبانوں میں شامل نہ ہوتے، ویسے جذباتی طور سے وہ بھی ہمارے قریب تھے)

نوعمر ترقی پسندوں کی ٹولی عجیب و غریب زندگی بسر کر رہی تھی، کچھ تو ابھی تک کالج اور یونیورسٹی میں پڑھ رہے تھے لیکن سارے ہندوستان میں مشہور ہو چکے تھے، کچھ ابھی ابھی تعلیم سے فارغ ہوئے تھے، ہمارے چار مشغلے تھے، تعلیم، ادب، سیاست اور آوارہ گردی۔ اس اعتبار سے ہم مختلف اوقات میں مختلف مقامات پر پائے جاتے تھے۔

ایک سرے پر فرنگی محل تھا، جس کے روشن خیال اور خوش اخلاق علماء کے ساتھ نہایت ادب سے انتہائی بے باک بحثیں کی جاتی تھیں، اور دوسرے سرے پر ریڈیو کی مشہور گانے والی گوہر سلطان کا وہ گھر تھا جسے ہم خرابات کہتے تھے، ان دونوں سروں کے درمیان نیشنل ہرالڈ، پانیر، ہندوستان، ویلو اور نیا ادب کے دفاتر، یونیورسٹی کے وائس چانسلر شیخ حبیب اللہ صاحب کا گھر، پروفیسر ڈی، پی مکرجی کا

www.taemeernews.com

کتب خانہ، وائی۔ڈبلو۔سی۔اے کا خوبصورت ھال جہاں مایا سرکار شمعِ محفل ہوا کرتی تھیں۔ یونیورسٹی کی لڑکیوں کا کیلاش ہاسٹل جہاں ہر سال ہولی کھیلنے پر جرمانہ ہوتا تھا۔ اور نہ جانے کتنے کافی ہاؤس، ریستوران اور میخانے تھے۔ اور یہ ساری گذرگاہیں کوچۂ یار سے ہوتی ہوئی زندانوں کی طرف جا رہی تھیں، جن کی دیواروں کے پیچھے آزادی کی خوبصورت صبح کا اجالا دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا اور اس کی دلفریبی ہماری نگاہوں کو دعوت نظارہ رہی تھی۔

ہمارا سارا گروہ جو دیسے تو ہم خیال تھا، مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو اور سبھاش بوس کے درمیان بٹا ہوا تھا، لیکن سوشلزم سے کسی کو انکار نہیں تھا۔

ہماری بغاوت کا انداز رومانی اور انفرادی تھا، جس کا سب سے حسین پیکر مجاز کی دل آویز شخصیت تھی۔ یہ پوری شخصیت اس کی نظم "آوارہ" اور "اندھیری رات کے مسافر" میں موجود ہے اور اس کے بکھرے ہوئے جلوے ان راتوں میں نظر آتے ہیں، جن میں سے پانچ راتوں کا انتخاب یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

بیشتر ترقی پسند ادیب اس رومانی مزاجی دور سے گذر رہے تھے، ہمارا گروہ ایک طرف تو اس بیرونی حکومت کے خلاف تھا، جس نے ڈیڑھ دو سو برس سے ہمارے ملک اور قوم کو غلام بنا رکھا تھا۔ اور دوسری طرف اس خاندانی شرافت اور رسم و رواج کے خلاف جو ہماری بے باک فطرتوں کو انگڑائی نہیں لینے دیتا تھا، چونکہ ہمارا تعلق کسی منظم سیاسی جماعت سے نہیں تھا اور ترقی پسندی تنظیم کم اور تحریک زیادہ تھی، اس لئے ہم اپنی من مانی کرنے کے لئے انفرادی راستے اختیار کرتے تھے، صاف ستھرے ڈرائینگ روم میں بیٹھ کر بیڑی پینا، شراب خانوں میں نظمیں سنانا، چوراہوں پر کھڑے ہو کر سیاسی تقریریں کرنا، کتابیں اور رسالے شائع کرنا اور پھر علما۔ اور پروفیسروں سے ٹیڑھے ٹیڑھے مباحثے کرنا بے چین روحوں کی تسکین کا سامان تھا۔

www.taemeernews.com

ایک دن دورانِ گفتگو میں یہ بات نکلی کہ لوگ اپنے کتوں کا نام ٹیپو کیوں رکھتے ہیں۔ میں، سبط حسن اور مجاز تینوں اس نتیجے پر پہونچے کہ انگریزوں نے ٹیپو سلطان سے اپنی نفرت کا اظہار کرنے کے لئے ایک طریقہ اختیار کیا ہے اور ٹوڈی قسم (غلامانہ ذہنیت) کے ہندوستانی ان کی نقل میں بے سوچے سمجھے اپنے کتوں کا نام بھی ٹیپو رکھ لیتے ہیں۔ اگر محبت سے رکھنے کا سوال ہوتا تو وہ یقیناً اپنے کتے کا نام وکٹوریہ نیلسن وغیرہ رکھتے۔ مجاز نے فوراً مشورہ دیا کہ ہم لوگوں کو ایک کتا پالنا چاہیئے اور اس کا نام نیلسن رکھنا چاہیئے۔

ابھی گفتگو جاری تھی کہ سبط حسن کہیں اٹھ کر چلے گئے، اور جب چند گھنٹوں کے بعد واپس آئے تو ان کی گود میں ایک نہایت خوب صورت سفید کتے کا پلا تھا، ہم لوگوں نے فوراً اسکا نام نیلسن رکھ دیا، اور گویا اپنے نزدیک انگریزوں سے ٹیپو سلطان کی توہین کا انتقام لے لیا۔

نیلسن نہایت خوب صورت اور وفادار کتا تھا۔ پہ مہینوں میں وہ بڑا ہو گیا، کاٹتا کسی کو نہیں تھا، لیکن بھونکنے میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا، ہم اپنے احباب کی فہرست میں ہمیشہ نیلسن کا نام شامل کر دیتے تھے۔

ہم تینوں لال باغ کے ایک نئے گھر میں رہتے تھے، جسے ڈاکٹر حسین ظہیر کی بیگم صاحبہ نے بنوایا تھا، اور اس کا نام ان کی مرضی کے خلاف ہم نے اکتوبر ہاؤس رکھ دیا تھا، گھر دو منزلہ تھا اور ہمارے سوا کوئی کرایہ دار ابھی آیا نہیں تھا، اس لئے ہم زمین کی منزل پر رہتے تھے، اور نیلسن پہلی منزل پر۔ ایک مہترانی جو باورچی خانے کے باہر کھڑکی کے پاس کھڑی ہو کر لکھنؤ کے لطیف لہجے اور نفیس زبان میں ہمیں کھانے پکانے کی ہدایات دیتی رہتی تھی۔ روز نیلسن کو نہلاتی تھی، ہم لوگ سارے دن ماہوار نیا ادب اور ہفتہ وار پرچم کی ترتیب اور اشاعت میں لگے رہتے اور شام کے وقت اپنے کتے کو ساتھ لے کر حضرت گنج کی سیر کے لئے باہر نکلتے۔ اس سیرگاہ کا انتخاب ایک خاص

www.taemeernews.com

غرض سے کیا گیا تھا، شام کے وقت اس کی سڑکیں اور دوکانیں یونیورسٹی کے لڑکوں لڑکیوں کے علاوہ گورے سپاہیوں اور ٹامیوں سے بھری ہوتی تھیں اور ہم لوگ ان کی صورتیں دیکھ کر اپنے کتے کو نیلسن کہہ کر ضرور آواز دیتے تھے اور طالب علموں اور ٹامیوں پر اس کا ردِ عمل دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے، مگر کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا۔

آخر ایک شام کو وہ حادثہ ہو گیا، جس کے لئے ہم بے تاب تھے، مے فیر سینما گھر میں کوئی بہت اچھی تصویر آئی تھی۔ اب نام یاد نہیں ہے۔ شاید واریز تھی۔ جس میں پال مُنی نے میکسکو کا انقلابی رہنما کا کردار ادا کیا تھا، یا شاید یانوشیک تھی۔ جس میں چکوسلواکیہ کے ایک باغی کسان کی ایک کہانی تھی، ایسی فلموں کو دیکھنے کے لئے یونیورسٹی کے طالب علموں کا ہجوم آتا تھا اور فلم کے خاتمے پر عین اس وقت جب انگریزوں کا قومی گیت (ہمارے لئے سامراجی گیت) گاڈ سیوری کنگ بجتا تھا، بلند آواز سے انقلابی نعرے لگاتا تھا۔

ہم تینوں نہایت شان سے اپنے کتے کو ساتھ لے کر مے فیر پہونچے اور چار ٹکٹ خرید کر ہال کے اندر داخل ہونے لگے۔ اس وقت نیلسن میری گود میں تھا۔ دروازے پر ہمیں روک دیا گیا۔ بڑی دیر تک اس پر ہنگامہ ہوتا رہا کہ نیلسن بھی تصویر دیکھے گا: آخر ہم نے اس کا ٹکٹ خریدا ہے اور کتا نہیں ہمارا دوست ہے۔ سینما کے منیجر نے جو ہمیں اچھی طرح جانتا تھا، خوشامد کر کے ہمیں راضی کیا، ٹکٹ کے پیسے واپس کئے، چائے پلائی اور رخصت کر دیا۔

ہم باہر نکلے تو میری ہم جماعت یونیورسٹی کی کچھ لڑکیاں مل گئیں۔ ایک ہجوم سینما گھر سے نکل رہا تھا، اور ایک اندر جا رہا تھا، ہم سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے اپنے کتے کے کارنامے بیان کر رہے تھے کہ نیلسن کے بھونکنے کی آواز آئی۔ ایک ٹامی جو شراب کے نشے میں دُھت تھا اور غالباً تصویر دیکھنے آیا تھا، نیلسن کو اپنے بید

www.taemeernews.com

سے چھیڑ رہا تھا ہم تینوں نے ایک ساتھ کتے کا نام لے کر اسے آوازیں دیں نیلسن نیلسن، ٹامی کتے کو چھوڑ ہماری طرف بڑھا، ہمارے ساتھ اتنی دیر میں ایک بہت مضبوط قسم کے کشمیری دوست آگئے تھے، جو اس زمانہ میں غالباً پانیر اخبار میں کام کر رہے تھے ان کے اور ٹامی کے درمیان گھونسے بازی شروع ہوگئی، ہمارا کشمیری دوست چک ہر گھونسے کے ساتھ نیلسن کا نعرہ بلند کرتا تھا اور کتا اپنا نام سن کر اور زیادہ زور سے بھونکتا تھا۔

لڑکیاں تتر بتر ہوگئیں اور یہ گھونسے بازی کوئی آدھے گھنٹے تک جاری رہی، پہلے تو ہم ہنس رہے تھے، لیکن جب معاملہ زیادہ سنگین ہوگیا تو میں نے اور سبط حسن نے بیچ بچاؤ کی کوشش کی، لیکن نہ تو ٹامی کا ہاتھ رکتا تھا اور نہ چک کا۔ لیکن دیکھنے کے قابل عالم مجاز کا تھا۔ وہ گھونسے بازی کی گت پر چٹکی بجا بجا کر ناچ رہا تھا، اور لہک لہک کر اپنے نامکمل گیت کے دو مصرعے گا رہا تھا ؎

بول اری او دھرتی بول
راج سنگھاسن ڈانواڈول

(اس گیت کی ابتدا چند ماہ پہلے گوہر سلطان کے گھر پر سبط حسن اور فرحت اللہ کے باہمی جھگڑے میں ہوئی تھی)

اب مجاز کے گیت، گھونسے بازی کے پینتروں، کتے کی بھوں بھوں اور چک کی زبان سے بلند ہوتے ہوئے نیلسن کے نعروں کے ساتھ ہم لوگ لڑتے لڑتے مے فیر سے جنرل پوسٹ آفس تک چلے گئے۔ خیریت ہوئی کہ اس آدھے گھنٹے کے عرصے میں کوئی ٹامی ادھر سے نہیں گزرا، اور کوئی پولیس والا گوری چمڑی کی امداد کے لئے نہیں آیا، آخر ٹامی تھک کر بے دم ہوگیا، اور اس نے جنرل پوسٹ آفس کے پاس پہونچ کر صلح کی پیش کش کر دی، طے ہوا کہ کل شام کو اس جگہ پھر گھونسے بازی کا مقابلہ ہوگا، چک نے اس کی زمین پر پڑی ہوئی ٹوپی اٹھالی اور کہا کہ یہ کل شام کو لڑائی کے

www.taemeernews.com

بعد واپس کی جائے گی۔

ہم لوگ ہنسنے لگے اور ٹامی لڑکھڑاتا ہوا واپس چلا گیا، سبط حسن نے بڑھ کر نیلسن کو اپنی گود میں لے لیا، اور اسے اس پیار سے تھپکا جیسے چک کے بجائے اس کتے نے ٹامی سے بازی جیتی ہو۔ مجاز نے ٹامی کی ٹوپی چک سے مانگ لی اور اپنے سر پر پہن لی۔

دوسرے دن شام کو وہ ٹامی وہاں نہیں آیا، ہم لوگ بڑی دیر انتظار کر کے کافی ہاؤس چلے گئے اور نیلسن کو ٹامی کی ٹوپی پہنا کر ایک کرسی پر بٹھا دیا۔

اس واقعے کے سات آٹھ برس بعد جب ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو میں اور مجاز بمبئی کے مسرت سے سرشار شہریوں کے ساتھ آدھی رات کو اوپیرا ہاؤس کے چوراہے پر آزادی کی خوشی میں ناچ رہے تھے تو یکایک مجاز نے اپنی جیب سے اس ٹامی کی میلی کچیلی، پرانی ٹوپی باہر نکالی اور اسے اپنے سر پر رکھ کر ترچھا کر لیا، اب وہ پھر چٹکی بجا بجا کر ناچ رہا تھا، اور گا رہا تھا۔

بول اری او دھرتی بول
راج سنگھاسن ڈانواڈول

گیت مکمل ہو چکا تھا اور سارا مجمع مجاز کے ساتھ گا رہا تھا۔

www.taemeernews.com

دوسری رات

"ایسی نہیں ہوتی ہے صبا در بدر کہ ہم"

وہ تمام راتیں ہمارے جسم، ہمارے دل، ہماری روح میں جذب ہو چکی ہیں، بے معنی، فضول طوفانی راتیں، مگر انھیں میں سے معنی اور مقصد کے ستارے جھانک رہے ہیں۔ جب ہم دن کو باہر نکلتے تو وہ راتیں ہمارے ساتھ چلتی تھیں، لوگ مڑ کر دیکھتے تھے اور آپس میں اشارے کرتے تھے "وہ نئے شاعر جا رہے ہیں"۔

مجاز عام طور سے علی گڈھ کی سلی ہوئی شیروانی پہنتے تھے اور میں کھدر کا کُرتا، پاجامہ۔ سبط حسن کے جسم پر کرتے پاجامے کے ساتھ ایک نفیس جیکٹ بھی ہوتا تھا، تینوں کے سر پر گاندھی ٹوپی جو ہر حالت میں ترچھی رہتی تھی (مجاز کے سر پر کبھی کبھی جاڑوں میں نرم سمور کی ٹوپی آجاتی تھی) میں لکھنؤ یونیورسٹی میں ایم۔اے کا طالب علم تھا، سبط حسن نیشنل ہرالڈ میں سب ایڈیٹر تھے۔ مجاز بے کار تھے اور صرف شاعری کرتے تھے مگر ہم تینوں مل کر نیا ادب نکالتے تھے اور بھینسا کُنڈ کے علاقے میں راجہ محمود آباد کی ایک بڑی سی کوٹھی کے چھوٹے سے کمرے میں رہتے تھے، خفیہ پولیس کے سادہ پوش سپاہی سائے کی طرح پیچھے لگے رہتے تھے نہ جانے کیوں۔

۱۹۳۹ء کی گرمیاں تھیں۔ شام ہو رہی تھی، ہم نے دن بھر کھانا نہیں کھایا تھا،

www.taemeernews.com

سگریٹ بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ ہمارا نوکر محمد جو ہمارے ساتھ فاقہ کشی کا عادی ہو چکا تھا، آج وہ بھی کوئی انتظام نہیں کر سکا تھا۔ وہ عام طور سے ہماری عدم موجودگی میں نیا ادب کے پرانے پرچے نہ جانے کہاں اور کیسے بیچ آتا تھا۔ اور کھانا پکا لیتا تھا اگر غلطی سے کوئی شامت کا مارا سی، آئی، ڈی کا آدمی چکر لگا لیتا تو اس کی خیر نہیں تھی، محمد اس کو پرانے پرچے تھما کر دو تین روپے ضرور وصول کر لیتا تھا، لیکن آج اتفاق سے سی، آئی، ڈی والے بھی ہمیں بھول گئے تھے۔ مجاز کے گھر کھانا مل سکتا تھا۔ لیکن وہاں جانا اس لئے خطرے سے خالی نہیں تھا کہ مجاز ایک ہفتے سے گھر سے غائب تھے، اور ان دنوں کا حساب دینے کے لئے بالکل تیار نہیں تھے۔

ہم تینوں بیٹھے سوچ رہے تھے کہ پریس سے نیا ادب کا پرچہ چھپ کر آ گیا، ہم نے فوراً اپنے دوستوں کی ایک فہرست مرتب کی اور ان کو نیا ادب کا خریدار بنانے کے لئے روانہ ہو گئے۔ خیال تھا کہ کچھ روپے آئیں گے تو کھانا بھی پک جائے گا، اور پرچہ بھی ڈاک میں چلا جائے گا۔

باغوں کے کنارے گذرتی ہوئی ٹھنڈی اور خاموش شاہ نجف روڈ پر۔ جو ہمارے گھر سے بہت دور نہیں تھی، ہم سب سے پہلے ایک پولیس سپرنٹنڈنٹ کے گھر پہونچے، وہ مجاز کی شاعری کے بڑے مداح تھے، اور اس پرچے میں مجاز کی نئی نظم چھپی تھی، سپرنٹنڈنٹ صاحب خود تو گھر پر موجود نہیں تھے، لیکن ان کے چھوٹے بھائی نے ہماری بڑی خاطر مدارات کی۔ چائے پینے کے بعد ہم نے سگریٹ جلایا، اور ان کو نیا ادب کا پرچہ پیش کیا، انھوں نے بڑے شوق سے رسالہ لے لیا اور جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر حاضر کر دیا، ہمارے پاس واپس کرنے کے لئے چھ روپے نہیں تھے، انھوں نے پانچ کا نوٹ دیا، لیکن ہمارے پاس تو ایک روپیہ بھی نہیں تھا، یہ دیکھ کر انھوں نے پانچ کا نوٹ بھی واپس لے لیا، اور دو تین دن نوکر کے ہاتھ چار روپے بھیجنے کا وعدہ کر کے ہمیں رخصت کر دیا۔ ہم

www.taemeernews.com

تینوں ایک دوسرے کی صورت دیکھتے باہر نکل آئے۔ ان کا یہ فقرہ بڑی دیر تک ہمارے کانوں میں گونجتا رہا "آپ تینوں کے پاس ایک روپیہ بھی نہیں ہے"۔

شام ڈھل کر رات ہو چکی تھی، اور فضا میں رات کی رانی کی خوشبو پھیل گئی تھی، سڑک سنسان تھی، اور میں سبط حسن دونوں خاموش تھے، اور مجاز زیرِ لب گنگنا رہا تھا ؎

رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے کہ میخانے میں چل
پھر کسی شہنازِ لالہ رخ کے کاشانے میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

سبط حسن نے مجاز کو دو تین بار کنکھیوں سے دیکھا، اور پھر جل کر کہا "ویرانہ دل میں ہوتا ہے باہر نہیں ہوتا"۔

کوئی ایک میل کے بعد ایک بیرسٹر صاحب کا گھر آیا، وہ علی گڈھ میں ہمارے ساتھ پڑھ چکے تھے، حال ہی میں انگلستان سے ایک انگریز بیوی لے کر واپس آئے تھے۔ ان کے دروازے پر پہونچ کر دیکھا کہ بیوی ٹارچ لئے کھڑی ہیں اور نوکر موٹر کو اونچا کرنے کی کوشش کر رہا ہے، اور بیرسٹر صاحب خود پہیا بدلنے کی فکر میں ہیں، ہم تینوں کو دیکھتے ہی بڑی بے تکلفی سے بولے کہ "بھئی خوب آئے، ذرا مدد کر دینا، میرا جیک ٹوٹ گیا ہے"۔ ہم تینوں نے نوکر کے ساتھ مل کر ان کی موٹر کو اونچا کیا، اور انھوں نے پہیا بدل دیا۔ پھر وہ اپنے ہاتھوں کو رومال سے صاف کرتے ہوئے فوراً موٹر میں بیٹھ گئے اور اپنی بیوی کے لئے دوسری طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے ہم سے مخاطب ہوئے "پھر ملاقات ہوگی، اس وقت ذرا باہر جانا ہے"۔ مجھے طیش آ گیا لیکن مجاز نے صبر سے کام لیا اور چپکے سے کہا "ہم تمہیں نیا ادب کا خریدار بنانے آئے تھے۔ بیرسٹر صاحب نے رسالہ لے لیا اور جیب سے ایک پرچے کا دام چھ آنے نکال کر مجاز کو دینے لگے،

www.taemeernews.com

اب مجاز کا بھی چہرہ تمتما اٹھا "موٹر اٹھانے کی مزدوری دے رہے ہو، پر یہ بھی رکھ لو"۔ اور واقعی بیرسٹر صاحب نے پیسے جیب میں رکھ لئے، اور موٹر اسٹارٹ کر دی، ہم کچھ اپنے کئے پر شرمندہ تھے، اور کچھ بیرسٹر صاحب کی حرکت پر ناخوش۔ خون کے گھونٹ پی کر چپ ہو رہے اور آگے چل دیئے، لیکن دل ہی دل میں بیرسٹر صاحب کا شجرۂ نسب دہرایا۔ اگر طبقاتی ہم آہنگی نہ ہو تو فکری ہم آہنگی ضروری ہے، اور وہ بھی نہ ہو تو پھر دوستی نہیں ہو سکتی، اس دن سے بیرسٹر صاحب کا نام ہمارے دوستوں کی فہرست سے کٹ گیا۔

لال باغ اور بشیشور ناتھ روڈ پر دو تین دروازے اور کھٹکھٹائے لیکن وہاں کسی سے ملاقات نہ ہو سکی۔ اب بھوک کے مارے برا حال تھا۔ اور تکان بھی محسوس ہو رہی تھی، لیکن ہم اپنی نامعلوم منزل کی طرف بڑھنے پر مجبور تھے۔

حضرت گنج سے گذرتے ہوئے ہمیں ایک بار (میخانے) کے سامنے بیرسٹر صاحب کی موٹر کھڑی ہوئی دکھائی دی۔ اسے نظر انداز کر کے ہم لوگ ایک لیڈی ڈاکٹر کے دروازے پر پہونچ گئے۔ ان کے گھر میں بیٹھ کر ہم لوگ بارہا اپنی نظمیں سنا چکے تھے اور یقین تھا کہ وہ مل گئیں تو مایوسی نہیں ہوگی، ہمارا نام سن کر وہ خود باہر نکل آئیں اور کہنے لگیں "اس وقت معافی چاہتی ہوں، گھر میں ایک پارٹی ہے"۔ اس پر سبط حسن نے انہیں نیا ادب پیش کیا، انھوں نے مسکرا کر پرچہ لے لیا، اور بغیر کچھ کہے اندر چلی گئیں۔ ہم سمجھے کہ دروازہ بھی بند ہو گیا۔ لیکن ابھی چند منٹ بھی نہیں گذرے تھے کہ وہ پھر باہر نکل آئیں۔ ان کے ہاتھ میں پچیس روپے کا چیک تھا، اس وقت اگر اس عطیے کے بجائے وہ ہمیں چھ روپے نقد دے دیتیں تو زیادہ خوشی ہوتی، ہم نے ان کا بے انتہا شکریہ ادا کیا، اور دوسرے دن اپنی نئی نظمیں سنانے کا وعدہ کر کے آگے بڑھ گئے۔

اب کہاں جائیں اور کیا کریں، رات کے نو بج چکے تھے، حضرت گنج کی روشنیاں

www.taemeernews.com

جگمگا رہی تھیں، ریسٹوران ہمیں بلا رہے تھے، لیکن ہماری جیب میں صرف ایک پچیس روپے کا چیک تھا۔

حضرت گنج سے ہمارے قدم بنارسی باغ کی طرف بڑھنے لگے، وہاں ہمارے ایک بڑے بے تکلف دوست ڈپٹی کلکٹر رہتے تھے۔ جو کچھ دن کے لئے لکھنؤ آتے تھے، ان کے نوکر نے ہمیں دیکھتے ہی کہا کہ ڈپٹی صاحب گھر پر نہیں ہیں اور ہم بغیر کسی سوال جواب کے واپس ہو گئے، ابھی تھوڑی دور گئے تھے کہ نوکر دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ "ڈپٹی صاحب گھر ہی میں ہیں۔ آپ کو بلا رہے ہیں"۔ امید کے چراغ کی لو پھر اونچی ہو گئی لیکن وہاں جا کر پہلے سے بھی زیادہ مایوسی ہوئی، ڈپٹی کلکٹر صاحب کے کوئی عزیز اپنے کسی دوست کا انتظار کر رہے تھے، انھوں نے ہم سے معذرت کی اور ہم نے اُن سے۔

اب بھینسا کنڈ واپس جانے کے سوا کوئی صورت باقی نہیں تھی، بھوک اور تکان نے ناکامی کی وجہ سے اور زیادہ نڈھال کر دیا تھا، یہاں سے مجاز کا گھر بھی دور تھا اور فرنگی محل اور بھی زیادہ دور جہاں فرحت اللہ اور حیات اللہ انصاری رہتے تھے۔ رفیع صاحب کے گھر کا فاصلہ بھی اچھا خاصہ تھا۔ ایک بار خیال آیا کہ اپنے وائس چانسلر شیخ حبیب اللہ صاحب کے گھر جا کر کھانا کھا لیں۔ اس کے دروازے ہمارے لئے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جب اپنے پاس کھانے کو ہو تو مانگنے کی ضرورت نہیں پڑتی اور نہ ہو تو پھر ایک شفیق اور مہربان استاد کا گھر بھی اجنبی لگنے لگتا ہے۔ جی چاہ رہا تھا کہ کوئی پہچاننے والا اپنی موٹر میں گذرے اور ہمیں گھر تک پہونچا دے۔

دور سے ایک یکہ آتا ہوا دکھائی دیا، ہم لوگوں نے اپنی جیبیں ٹٹولیں کہیں ایک چوکھنٹی دوانی پڑی ہوئی مل گئی اور ایک جیب سے ایک کھوٹی اکنی نکل آئی، اتنی دیر میں یکہ قریب آ گیا۔ یکہ والے کی گود میں ایک بچہ تھا، اور دودھ کی بوتل پاس

www.taemeernews.com

رکھی تھی، اس نے بتایا کہ بچے کی ماں مر چکی ہے، اور وہ دن بھر بچے کو اپنے ساتھ یکّے میں لئے پھرتا ہے، ہم نے پوچھا "بھینسا کُنڈ تک پہونچانے کا کیا لوگے"۔ اس نے تین آنے مانگے، ہم نے دو آنے پر معاملہ طے کرنا چاہا اور آخر میں یہ بھی کہہ دیا کہ "بھئی ایک کھوٹی اکنّی بھی ہے" اس نے لگام گھوڑے کی پیٹھ پر جھٹک دی، اور یہ کہتا ہوا چلا گیا، "میاں کیوں مذاق کر رہے ہیں"۔

حضرت گنج میں کافی ہاؤس کے سامنے سے ہوتے ہوئے جب ہم گھر کی طرف مڑے تو ایک تاڑی خانہ یکایک سامنے آگیا، ہوا میں پھیلی ہوئی تاڑی کی خوشبو نے ہمیں دعوت دی اور ہمارے قدم خود بخود رک گئے، مجاز نے کہا "یار تاڑی کبھی نہیں پی ہے، کیا مزہ آتا ہے"۔ مگر ہم میں سے کسی نے بھی تاڑی نہیں پی تھی، میں نے تاڑی کی غریب پروری کا قصیدہ پڑھا اور سبط حسن نے اس کی غذائی خوبیوں پر روشنی ڈالی، اور مجاز یہ دریافت کرنے کے لئے اندر گھس گئے کہ اچھی دوانّی اور ایک کھوٹی اکنّی میں کتنی تاڑی مل سکتی ہے، چند لمحوں میں مجاز کی آواز آئی اور میں اور سبط حسن خوشی سے پھولے نہیں سمائے، لیکن ہمارا اندر قدم رکھنا تھا کہ معلوم ہوا جیسے تاڑی خانے پر بجلی گر پڑی۔ دو تین پینے والے خوفزدہ نظروں سے ہمیں دیکھنے لگے اور تاڑی خانے کا مالک ہاتھ جوڑ کر سامنے کھڑا ہو گیا اور عذر کرنے لگا کہ "میں وقت ختم ہونے کے بعد تاڑی نہیں بیچتا حضور۔ یہ دو تین آدمی دیر سے بیٹھے ہیں اور گھر جانے کا نام نہیں لیتے"۔ دراصل اسے بھی یکّے والے کی طرح ہمارے کھدر کے کپڑوں سے دھوکا ہوا، اور وہ ہمیں سرکاری آدمی سمجھ کر معذرت کرنے لگا، (کانگریس کی پہلی وزارت آنے کے بعد بڑے بڑے سیٹھ ساہوکاروں کے علاوہ خفیہ پولیس کے لوگوں نے بھی کھدر پہننا شروع کر دیا تھا،) ہم نے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی، خوشامد تک کی، لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

آخر ہم تینوں تھکے ہارے گھر واپس آگئے، لیکن اندر قدم رکھتے ہی معلوم ہوا کہ

www.taemeernews.com

ہمارے نوکر محمد نے کوئی کرشمہ دکھایا ہے۔ باورچی خانے سے نہایت اشتہا انگیز خوشبو اور کباب تلنے کی آواز نے ہمارا استقبال کیا۔

میں نے پکار کر پوچھا "محمد کیا کسی سی، آئی، ڈی والے کو ذبح کر لیا"۔ اس نے باورچی خانے سے نکل کر ہنستے ہوتے میز کی دراز کی طرف اشارہ کیا، ہم نے دراز کھولی تو معلوم ہوا کہ تین سو کا منی آرڈر آیا ہے اور وہ ابھی تار کے ذریعے سے جو ہماری عدم موجودگی میں محمد نے وصول کر لیا تھا۔

کانپور کے طالب علموں اور مزدوروں نے نیا ادب کے پچاس خریدار بنا لیے تھے، اور کچھ عطیات جمع کیے تھے۔

---

www.taemeernews.com

تیسری رات

یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

دوسری عالم گیر جنگ کو شروع ہوئے ایک سال سے زیادہ ہوگیا تھا، اسپین کی جمہوریت کو ختم کرنے کے لئے ہٹلر اور مسولینی نے جن ہتھیاروں کی آزمائش کی تھی، اب وہ انگلستان اور فرانس کے خلاف استعمال ہو رہے تھے، چیمبرلین نے سوڈٹین لینڈ کے خلاف جو بے وفائی کی تھی اس کی قیمت خون سے ادا کی جا رہی تھی، کانگریس کے رہنماؤں کو جرمن اور اطالوی فاشزم سے نفرت تھی اور وہ یورپ کی تہذیب، اطالوی اور فرانسیسی جمہوریت کو لوہے اور خون کے سیلاب میں غرق ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ لیکن وہ جن کی جمہوریت اور تہذیبی روایات سے ہمیں ہمدردی تھی، ہم پر حکومت کر رہے تھے اور ظاہر ہے کہ ایک غلام ہندوستان برطانیہ کی مدد کرنے سے قاصر تھا، چنانچہ کانگریس کی وزارت جو ۱۹۳۷ء میں بنی تھی، مستعفی ہو چکی تھی، گاندھی جی کی رہنمائی میں انفرادی ستیہ گرہ جاری تھی، گورکھپور کی عدالت میں پنڈت جواہر لال نہرو کے بیان نے سارے ملک میں ایک آگ سی لگا دی تھی، ہندوستان آزادی کو ناقابل تقسیم سمجھتا تھا اور اس لئے برطانوی آزادی کی حفاظت کے ساتھ ساتھ اپنی آزادی کا بھی مطالبہ کر رہا تھا، لیکن برطانوی سامراج ہماری

www.taemeernews.com

آزادی کا حامی نہیں تھا، چنانچہ روزانہ کوئی نہ کوئی قومی رہنما گرفتار ہوتا تھا اور ہر گرفتاری پر لکھنؤ یونیورسٹی کے طالب علم احتجاج کرتے تھے۔

میں ایم اے کے آخری سال کا طالب علم تھا، اور یونیورسٹی یونین کا سکریٹری اس لئے احتجاج کی تنظیم کی تمام تر ذمہ داری مجھ پر تھی، میں نے گھر چھوڑ کر جہاں مجاز اور سبط حسن رہتے تھے، حبیب اللہ ہوسٹل کو اپنا قلعہ بنا لیا تھا، گومتی کے ساحل پر یونین کی عمارت میں میرا آفس تھا جہاں بیٹھ کر ہڑتال اور احتجاج کے نقشے تیار ہوتے تھے۔

پہلے ہڑتالیں ہوتیں۔ پھر یہ محسوس کر کے کہ اس سے تعلیم کا نقصان ہوتا ہے، ایک نیا راستہ نکالا گیا، جب کسی قومی رہنما کی گرفتاری کی جاتی تو دن کے بارہ بجے ساری یونیورسٹی میں سیٹیاں بجنے لگتیں اور ہر کلاس میں طالب علم اٹھ کر کھڑے ہو جاتے، اور تعلیم بند ہو جاتی، وہ پانچ منٹ تک احتجاج کے طور پر کھڑے رہتے اور پھر بیٹھ جاتے۔

ایک دن میرے ایک بڑے محترم استاد نے مجھے اپنے گھر بلا کر کہا کہ پولیس تمہاری تلاش میں ہے۔ یونیورسٹی کی ہڑتالوں کے علاوہ فوجی بھرتی کے خلاف میری ایک نظم بھی سرکار کی نگاہوں میں قابلِ اعتراض تھی۔ اس دن کے بعد سے میں نے یونیورسٹی کے علاقے سے باہر جانا ترک کر دیا، ابھی تک ایک تعلیمی ادارے کا اتنا احترام تھا کہ پولیس اندر داخل نہیں ہوتی تھی، سی، آئی، ڈی کے لوگ یونین کی عمارت کے سامنے منکی برج کے پاس کھڑے نظر آتے تھے، اور میں ان کی نگاہوں کے سامنے سے گذر جاتا تھا۔

اس دوران میں ایک نہایت اشتعال انگیز واقعہ ہوا، خبر آئی کہ دہلی یونیورسٹی کے چانسلر سر ماریس گوائر نے سیاسی تحریک میں حصہ لینے کے جرم میں دو طالب علموں کی ڈگری ضبط کر لی ہے، لکھنؤ یونیورسٹی میں نومبر ۱۹۴۰ء میں کانووکیشن ہونے والا تھا، اور سر ماریس گوائر جو ہندوستان کے چیف جسٹس تھے اور گاندھی جی کے

www.taemeernews.com

دوست بھی مشہور تھے) خطبہ پڑھنے آرہے تھے، فوراً طالب علموں کی پنچایت بیٹھ گئی۔ اور فیصلہ ہوا کہ جب تک دہلی یونیورسٹی کے طالب علموں کی ڈگری واپس نہ مل جائے۔ اس وقت تک سر ماریس گوائر ہمارے یہاں خطبہ نہیں پڑھیں گے۔ خاموشی سے ساری تیاری کی گئیں اور جس دن وہ یونیورسٹی میں آتے، طالب علموں نے مکمل ہڑتال کردی اور پرجوش نعروں سے ان کا خیر مقدم کیا گیا۔ ان نعروں کے غیظ و غضب سے بچنے کے لئے ہمارے محترم مہمان کو پولٹیکل سائنس ڈپارٹمنٹ کے ایک کمرے میں پناہ لینے پر مجبور ہونا پڑا، مجھے اندر بلایا گیا اور پروفیسر سدھانت نے، جو میرے شفیق استاد تھے، دریافت کیا کہ ہم لوگ کیا چاہتے ہیں، میں نے طالب علموں کا نقطۂ نگاہ پیش کیا۔ اس پر سر ماریس گوائر نے نہایت خندہ پیشانی سے کہا کہ وہ واپس جانے کے لئے تیار ہیں، لیکن سوال یہ تھا کہ طالب علم ان پر حملہ تو نہیں کریں گے، میں نے ان کی حفاظت کی ذمہ داری لے لی، لڑکوں اور لڑکیوں نے دو قطاروں میں تقسیم ہوکر موٹر تک جانے کا راستہ بنا دیا اور سر ماریس گوائر کو عزت اور احترام کے ساتھ رخصت کر دیا۔

ہم اس فتح پر نازاں تھے لیکن لکھنؤ کے سرکاری حلقوں میں ایک قیامت برپا ہوگئی، کہا جاتا ہے کہ خود صوبے کے انگریز گورنر نے ہمارے وائس چانسلر کو ہدایت کی کہ مجھے اور دوسرے باغی طالب علموں کو یونیورسٹی سے نکال دیا جائے، لیکن شیخ حبیب اللہ صاحب نے اس اقدام سے انکار کر دیا اور اپنے طور پر سزا دینے کا وعدہ کیا لیکن آخر میں تھوڑی سی باز پرس کرکے ہمیں معاف کر دیا، جس دن یہ فیصلہ سنایا گیا اس دن وائس چانسلر کے دفتر کے سامنے طالب علموں کا ایک بڑا زوردار جلسہ ہوا، مجاز بھی کہیں سے آگئے، اور احاطے کی دیوار پر کھڑے ہوکر نظم سنانے لگے ؎

مسافر بھاگ وقت بے کسی ہے
ترے سر پر اجل منڈلا رہی ہے

اور ساری فضا نعروں سے گونج اٹھی، سڑک کے دوسری طرف یونیورسٹی کی سرحد کے

www.taemeernews.com

باہر سی، آئی، ڈی کے سادہ پوش کھڑے ہوتے تھے اور آفس کے برآمدے میں حبیب اللہ صاحب، پروفیسر سدھانت اور دوسرے پروفیسرز۔ اس کے بعد کوئی شبہ نہیں رہ گیا کہ یونیورسٹی کے نوجوان طالب علم ہی نہیں بلکہ استاد بھی قومی تحریک آزادی کے ساتھ تھے۔

آخر ایک دن مجھے اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی ایک ضروری میٹنگ کے لئے یونیورسٹی کے علاقے سے باہر نکلنا پڑا، میٹنگ کے بعد جب میں گنگا پرشاد میموریل ہال کی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا، تو سی، آئی، ڈی کے ایک انسپکٹر نے مجھے گرفتار کر لیا، مقامی تھانے میں میری تلاشی لی گئی، تو میرے جیبوں سے سیاسی دستاویزوں کے بجائے چند تصویر بتاں، چند حسینوں کے خطوط کے قسم کی چیزیں باہر نکلیں، میرے اصرار اور احتجاج کے باوجود پولیس انسپکٹر نے کسی لڑکی کے ہاتھ کا لکھا ہوا محبت نامہ اور اس کی تصویر واپس کرنے سے انکار کر دیا، گرفتاری کی مجھے کوئی پرواہ نہیں تھی، لیکن وہ خط اور وہ تصویر۔ یہ اپنی جگہ ایک دنیا تھی، جو صرف میری تھی اور اس میں کسی اجنبی کو داخل ہونے کا حق نہیں تھا۔

شام ہوتے ہوتے مجھے لکھنؤ ڈسٹرکٹ جیل میں منتقل کر دیا گیا، میں نے پہلی بار زندان کی بھوری اداس دیواریں اور مغرور آہنی سلاخیں دیکھیں جو میرے چاروں طرف کھڑی ہوئی تھیں، اس رات میں نے بڑی شدت سے محسوس کیا کہ گومتی کتنا خوبصورت لفظ ہے، لکھنؤ میں کیا لطافت ہے، اس کے علاقوں کے نام کتنے رومانٹک ہیں۔ قیصر باغ، حضرت گنج، چاند باغ، بادشاہ نگر، ڈالی گنج۔ یونیورسٹی کی حسین عمارتیں باغوں سے آراستہ ہیں، پھول، خوب صورت چہرے، نوجوان قہقہے، بے فکری، بیقراری، ملک کی آزادی کی لگن۔ اور ایک ان دیکھی ان جانی دنیا کی ذہنی تلاش۔ اور اس جذبے میں شاعری، سیاست، عشق سب مل کر ایک ہو گئے ہیں، شاید اسی لئے انسپکٹر نے ایک تصویر اور ایک معصوم خط مجھ سے چھین لیا تھا۔

www.taemeernews.com

جیلر گٹھے ہوئے جسم کا ایک پستہ قد آدمی تھا، جس کی بڑی بڑی مونچھیں اس کے نیچے کے ہونٹوں پر جھکی رہتی تھیں اور پانی پینے کے لئے اسے اپنی مونچھوں کو ہاتھ سے اوپر اٹھانا پڑتا تھا، پھر بھی کچھ بال پانی میں ڈوب جاتے تھے، اس کا تکیہ کلام تھا۔ "میں بہت دکھی ہوں۔ ایک ودھوا بہن ہے اور ایک بیٹی کی شادی کرنی ہے"۔ اپنا دکھ وہ ہر قیدی سے بیان کرتا تھا اور حد یہ ہے کہ جس دن ایک قاتل کو پھانسی ہوئی اس دن بھی جیلر نے ہمارے سامنے اپنا دکھ بیان کر دیا، گویا اس کی پھانسی، ودھوا بہن کی مصیبت اور جوان بیٹی کی شادی۔ تینوں کا بڑا گہرا تعلق ہے۔

پولیس انسپکٹر نے مجھے جیلر کے سپرد کیا اور میرے کاغذات اس کے سامنے بڑھا دیئے، میرا نام پڑھ کر جیلر نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور ایک دم سے اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور انسپکٹر سے کہا "جعفری صاحب تو بہت بڑے آدمی ہیں اور آپ ان کو سی کلاس میں رکھنا چاہتے ہیں"۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ جیلر نے یہ رائے کیسے قائم کی۔ شاید وہ ہر سیاسی قیدی کو بڑا آدمی سمجھتا ہوگا۔ انسپکٹر نے کہا "اسی لئے تو میں انھیں جیل میں لے آیا ہوں۔ کل اتوار ہے۔ بی کلاس کا آرڈر پرسوں تک آئے گا۔ سوچا لاک اپ میں تکلیف ہوگی، جیل میں آرام سے رہیں گے"۔

جیلر نے مجھے کرسی پیش کی اور کاغذات پر دستخط کر کے انسپکٹر کو واپس کر دیا، اب اس نے پہلے تو مجھ سے اپنا دکھ بیان کیا اور پھر پوچھا کہ "آپ اس چکر میں کیسے پھنس گئے"۔ مجھے سوال مہمل معلوم ہوا اور میں نے اسے جھڑک دیا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے سی کلاس کی بارک میں پہونچا دیا گیا، جیل کی چہار دیواری کے اندر ایک اور چہار دیواری تھی، اور اس کے اندر ایک بڑی سی بارک جس میں دس بارہ لمبی لمبی کھڑکیاں تھیں اور موٹی موٹی سلاخیں۔ کھڑکیوں کے سامنے دو رویہ قبریں بنی ہوئی تھیں، اور ہر قبر پر ایک کمبل بچھا ہوا تھا، گویا یہ قیدیوں کے بستر تھے، دروازے پر ایک اندھی لالٹین لٹک رہی تھی، اور ایک وارڈر موٹا سا ڈنڈا لئے کھڑا تھا،

www.taemeernews.com

قیدیوں کی صورتیں دیکھ کر مجھے اندازہ ہوگیا کہ میں کہاں ہوں، دو تین کے پیروں میں کڑے اور زنجیریں بھی پڑی ہوئی تھیں جو کروٹ لیتے وقت بجنے لگتی تھیں۔ ایک قبر میرے حصے میں بھی آئیں۔ کمبل کے علاوہ ایک لوہے کا تسلا اور ایک ٹین کا تاملوٹ بھی انعام میں ملا، کئی قیدیوں نے اپنی اپنی قبروں سے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور میری سفید پوشی سے مایوس ہوگئے۔ وارڈر نے میرے پاس آکر بڑے ادب سے مخاطب کیا جس کی مجھے توقع نہیں تھی، اور سی کلاس کے قانون کے خلاف مجھے بیڑی پیش کی، اور پھر میں سوچنے لگا کہ ان لوگوں کو مجھ میں کون سے سُرخاب کے پر نظر آتے ہیں۔ آخر میری اتنی خاطریں کیوں ہو رہی ہیں۔

میں سخت کھردرے کمبل پر بیٹھا ہوا تھا کہ بارک کا دروازہ کھلا اور جیلر کی بڑی بڑی مونچھیں اندر داخل ہوگئیں، ان کے ساتھ ایک وارڈر تھا، اس نے میری دو تین کتابیں اٹھالیں اور جیلر صاحب اپنے مصائب بیان کرتے ہوئے مجھے بارک سے باہر نکال لائے۔ معلوم ہوا کہ میرا تبادلہ بی کلاس میں کیا جا رہا ہے۔ "صاحب سی کلاس تو چور بدمعاشوں کے لئے ہوتا ہے۔ انسپکٹر کی ایسی تیسی میں آپ کو بی کلاس میں رکھوں گا، اگر کرنل صاحب کو معلوم ہوگیا کہ آپ یہاں ہیں تو بڑی مشکل ہو جائے گی اور آپ تو جانتے ہیں میں بڑا دکھی ہوں"۔ ایک ودھوا بہن ہے اور ایک لڑکی کی شادی کرنی ہے"۔ میں حیران تھا کہ یہ کرنل صاحب کون ہیں، جن کے خوف سے مجسٹریٹ کے حکم کے بغیر مجھے سی کلاس سے بی کلاس میں منتقل کیا جا رہا ہے۔

بی کلاس کی بارک میں پہونچ کر طبیعت باغ باغ ہوگئی اور میں تھوڑی دیر کے لئے کھوئی ہوئی تصویر اور خط کو بھول گیا، وہاں ڈاکٹر حسین ظہیر اور سی بی گپتا پہلے سے موجود تھے، دونوں رمی کھیل رہے تھے، اور تاش کے پتے ان کے ہاتھ میں تھے، جب وہ اٹھ کر کھڑے ہوتے تو سی بی گپتا کے کمبل کے نیچے سے جو وہ اوڑھے ہوتے تھے، ایک جوکر تڑپ کر باہر آگیا اور زمین پر گر کر ہنسنے لگا۔

www.taemeernews.com

برابر کی دوسری بارک میں سردار چندر سنگھ گڑھوالی تھے، جنہوں نے پشاور میں پٹھانوں پر گولی چلانے سے انکار کیا تھا اور اب عمر قید کی سزا کاٹ رہے تھے، عمر قید کے تین اور قیدی بھی وہاں تھے، ڈاکٹر گیا پرشاد، جے دیو کپور اور شیو درما، یہ تینوں سردار بھگت سنگھ کے ساتھی تھے۔ اور ایک لمبی بھوک ہڑتال کے بعد کالے پانی سے ہندوستان واپس لائے گئے تھے۔ انھوں نے اپنی بارک سے پکار پکار کر بلند آوازوں سے میرا خیر مقدم کیا۔

یہ میری زندگی میں جیل کی پہلی رات تھی، لکھنؤ کے ہلکی گلابی جاڑوں کی سینکڑوں راتوں کی طرح ٹھنڈی اور خوش گوار۔ ڈاکٹر حسین ظہیر اور سی بی گپتا اس کے عادی ہو چکے تھے، اور اس لئے بستر پہ لیٹتے ہی سو گئے، لیکن مجھے اس کا بھیانک پن محسوس ہو رہا تھا، ایسا لگ رہا تھا جیسے وقت ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا ہے، اور صرف سناٹا ہے، جس میں دل کی دھڑکن ہی نہیں پلکوں کے جھپکنے کی آواز بھی سنی جا سکتی ہے، یکایک سناٹا ٹوٹ گیا۔ خاموشی چیخ اٹھی، کسی کے قدموں کی چاپ کے ساتھ لوہے کی سلاخوں پر ہتھوڑی کی کرخت آواز کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ کرتی گذر گئی، اور ساری جیل عجیب و غریب نعروں سے گونج اٹھی۔ "تالا، جنگلا، بیل، لالٹین سب ٹھیک ہے"۔ پہلی بار معلوم ہوا کہ بیل کا خوب صورت لفظ زنجیر کے لئے بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ اور میری یادوں میں عشق پیچاں کی ہری ہری نازک بیلیں پھیل گئیں، جن میں ننھے ننھے سرخ پھولوں کے ہزاروں چراغ جل رہے تھے۔

زندگی کتنی حسین ہے۔ ہرے بھرے درختوں کے سائے میں پھولوں کی کیاریاں مہک رہی ہیں، گلاب کی ادھ کھلی کلیوں پر شبنم کے قطرے جم گئے ہیں، گھڑوں کا پانی بے حد ٹھنڈا ہے۔ گھاس پر دور تک موتی ہی موتی بکھرے ہوتے ہیں، شکنتلا جیسال کے بال جوگنوں کی طرح شانوں پر لہرا رہے ہیں، انور جمال قدوائی مہکی مہکی باتیں کر رہا ہے، اس کی آنکھوں میں وحشت اور ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے، ہیزل باب

www.taemeernews.com

لڑکوں کے ہجوم میں کھڑی ہوتی ہے، غوث محمد ٹینس کھیل رہا ہے، مجاز گوہر سلطان کو اپنی خاموش اور معصوم نگاہوں سے تکے جا رہا ہے، یونیورسٹی میں کرکٹ ہو رہا ہے، تانگوں میں سوار اور سائیکلوں پر بیٹھی ہوئی لڑکیاں رات کے اندھیرے میں حضرت گنج سے کیلاش ہوسٹل اور چاند باغ واپس جا رہی ہیں۔ لیمپ جل رہے ہیں شیخ حبیب اللہ انوکھی انگریزی بول رہے ہیں۔ تزئین حبیب اللہ بے وجہ کھل کھلا کر ہنس رہی ہے، انصار ہروانی اور منشی بلرام سنگھ سر جوڑے بیٹھے ہیں، علی جواد زیدی نظم سنا رہا ہے، "ساگر تٹ پر بیٹھے بیٹھے تو کیوں لہریں گنتا ہے"۔ طالب علموں کا جلوس نکل رہا ہے، جھنڈے لہرا رہے ہیں۔ سبک خرام گومتی ازلی اور ابدی رفتار سے بہتی چلی جا رہی ہے، اس کے کنارے کی جھاڑیوں میں آنچل الجھ رہے ہیں، ریت پر قدموں کے نشان مٹ رہے ہیں اور بگڑ رہے ہیں، میں بہتی ہوئی موجوں کے قریب ریت کے ڈھال پر بیٹھا ہوا اپنی کھوئی ہوئی تصویر کو منا رہا ہوں ؎

یہ ٹھیک ہے کہ تمہیں دیر ہو رہی ہے مگر
ذرا سی دیر میں کیا ہے، ابھی چلی جانا
ابھی ہواؤں میں اڑتا ہے شام کا آنچل
ابھی تو رات کی آنکھوں میں بھی خمار نہیں
سحر کے وقت سے جو اڑ رہی تھیں وہ چڑیاں
ابھی تو لوٹ کے آئی ہیں آشیانوں میں
وہ اپنے گیت سنا لیں تو پھر چلی جانا

سورج ڈوب رہا ہے، شام شفق میں تبدیل ہو رہی ہے، آسمان سے گلابی رنگ کی بارش ہو رہی ہے، پورب سے چاند نکل رہا ہے ؎

وہ دیکھو مولسری کے درخت کے پیچھے
افق کی گود میں رکھا ہوا ہے، چاند کا سر

www.taemeernews.com

وہ دیکھو رات کی آغوش میں سمٹ آئی
عروسِ شام کی دوشیزگی و رعنائی
لپٹ کے سو گیا سورج زمیں کے سینے سے

شفق کا رنگ تمتماتے ہوئے رخساروں میں تحلیل ہو رہا ہے، شام آنکھوں میں ڈوب رہی ہے۔ صرف ستارے تماشائی ہیں ؎

یہ ناچتے ہوئے تارے یہ ناچتی ہوئی رات
ناچتی ہوئی نوخیز چاند کی کرنیں
یہ گنگناتی ہوئی نرم رو ہوا، یہ فضا
یہ میرے خون کی گردش، یہ دھڑکنیں دل کی
تمہیں بھی ہوتی ہیں محسوس یا نہیں ہوتیں

لیکن وہاں صرف ایک خاموشی ہے، ایک بے چین اور اداس خاموشی۔ چاندنی نے اسے اور زیادہ پر اسرار بنا دیا ہے، ایک انجانا خوف چاروں طرف سے گھیر لیتا ہے، ہم قریب ہیں، ہاتھ میں ہاتھ ہے پھر بھی ایک عجیب و غریب دوری ہے ؎

ہمارے بیچ میں حائل وہ آگ ہے کہ جسے
ہماری آنکھ کے آنسو بجھا نہیں سکتے
برہنہ پا ہمیں اس آگ پر گذرنا ہے
اسی میں تپ کے ہمیں ایک دن نکھرنا ہے
نہ جانے تم مری بات سمجھتی ہو کہ نہیں

یکا یک صبح ہو گئی اور اس کے اجالے میں خواب و خیال کے سارے کردار کھو گئے، جیل کی چائے، جیل کے احباب، جیل کے وارڈرز۔

دس بجے کے قریب خبر ملی کہ "ملاقات آئی ہے"۔ میں جلدی سے تیار ہو کر پھاٹک پر پہونچا، مجاز اور سبط حسن ملنے آئے تھے، اور ان کے ساتھ وہ لڑکی بھی تھی، آنکھیں

www.taemeernews.com

سوجی ہوئی تھیں اور رات بھر رونے کی وجہ سے گلابی ہوگئی تھیں، پھر بھی ہونٹوں پر مونولیزا کی مسکراہٹ تھی۔

اس نے وارڈر کی آنکھ بچاکر جلدی سے ایک لفافہ مجھے دے دیا، پھر سگریٹ اور چائے کے ڈبے دیئے، مجاز نے اس کی تصویر اور خط مجھے دیا جو انسپکٹر نے چھین لیا تھا، مجاز شام کو میری تلاش میں پولیس اسٹیشن گیا تھا، اور جب انسپکٹر جیل سے واپس ہوا تو مجاز نے اسے نظمیں سنائیں اور تصویر اور خط وصول کرنے میں کامیاب ہوگیا، یہی نہیں بلکہ انسپکٹر کے حساب میں مجاز نے کسی میخانے میں بیٹھ کر شراب بھی پی، لڑکی نے مجاز کو بڑی احسان مند نگاہوں سے دیکھا اور مجھ سے پوچھا کہ "تم کس کلاس میں ہو" قبل اس کے کہ میں جواب دیتا، سبط حسن اور مجاز لڑکی کے ساتھ مل کر ہنسنے لگے۔ انھیں جیلر سے وہ لطیفہ معلوم ہوگیا تھا، جو اب تک میرے لئے راز تھا۔ مجھے غلطی سے جیل کے سپرنٹنڈنٹ کرنل جعفری کا داماد سمجھ لیا گیا تھا، اور اسی لئے سی کلاس سے بی کلاس میں منتقل کر دیا گیا تھا، میری گرفتاری سے دس بارہ دن پہلے کرنل جعفری کی بیٹی کی شادی ہمارے علی گڈھ کے ایک ساتھی اور دوست سعید جعفری آئی۔ سی۔ ایس سے ہوئی تھی، جس میں جیل کا سارا اسٹاف شریک ہوا تھا، اور جب میں جیل میں آیا تو ہمارے مصیبت زدہ جیلر نے سعید جعفری اور سردار جعفری کو ایک ہی سمجھ لیا، ہم سب دیر تک اس لطیفے سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ رخصت ہونے سے کچھ پہلے سبط حسن نے اپنا بیگ کھولا اور ایک کاغذ نکال کر مجھے نیا ادب کا نیا ایڈیٹوریل سنانے لگے جو آئندہ اشاعت میں شائع ہوگا، ایڈیٹوریل میرے بارے میں تھا اور غالب کے دو شعروں سے شروع ہوا تھا۔

خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیا
ہیں گرفتارِ بلا زنداں سے گھبرائیں گے کیا
گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

www.taemeernews.com

سبط حسن سنجیدہ تھے۔ مجاز کے باریک ہونٹوں پر پھلجھڑی چھوٹ رہی تھی، میں بے انتہا خوش تھا، اور وہ جو اداس اور غم گین لڑکی تھی، اس نے رخصت ہونے کے بہانے سے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا، اور میری آنکھوں میں اس طرح آنکھیں ڈال کر دیکھا کہ میرے دل میں کوئی شبہ باقی نہیں رہ گیا۔

---

www.taemeernews.com

چوتھی رات

دیکھ آکر کوچۂ چاکِ گریباں کی بہار

وہ رات بڑی طوفانی تھی۔ دسمبر ۱۹۴۱ء کا مہینہ تھا، اور سرد ہوا کا جھکڑ چل رہا تھا، قندھاری لین میں ہمارے گھر کے سامنے کھڑا ہوا املی کا پرانا تناور درخت کسی عظیم اور قدآور دیو کی طرح جھوم رہا تھا، اس کی شاخیں ایک دوسرے سے ٹکراتی تھیں اور سائیں سائیں کی مسلسل آوازوں کے ساتھ بے شمار چھوٹی چھوٹی پتیاں برسنے لگتی تھیں، ہوا ہزاروں پروں سے پرواز کر رہی تھی۔ سڑکوں کی بجلی کی بعض روشنیاں جو کھمبوں کے بجائے تاروں سے لٹکی ہوئی تھیں، لمبی لمبی پینگیں لے رہی تھیں اور سائے دیوانہ وار ناچ رہے تھے، خود ہمارے سائے بھی کبھی پیچھے اور کبھی آگے آکر ناچنے لگتے، رات اپنے شباب پر تھی۔ اور ہمارے دلوں میں ایک احساسِ فتحمندی تھا، ہم آل انڈیا ریڈیو سے نووارد شعراء کا مشاعرہ پڑھ کر واپس آرہے تھے۔

نووارد شعراء کا مشاعرہ، منتظم آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کے اسٹیشن ڈائرکٹر سومناتھ چپ معشوقِ عاشق پیشہ، صدارت کے فرائض شاعرِ انقلاب جوشؔ ملیح آبادی نے انجام دیئے۔ آج خود انہیں کے نظم سنانے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا، وہ نوعمر ترقی پسند شاعروں کا کلام سننے آئے تھے، وجیہہ اور سُرخ و سپید رنگ، دلنواز اور معصوم تبسم، آنکھوں میں

www.taemeernews.com

شفقت، محبت اور غرور، باقی سارے انداز میں ایک باوقار بندی ہے

جوشؔ کی بحثِ صدارت میں پس و پیش نہ کر
جوشؔ تو قبلۂ رندانِ جہاں ہے ساقی

مشاعرہ سننے والے لکھنؤ کے صاحبانِ ذوق، وہ بھی جو نئی شاعری کے پرستار تھے، اور وہ بھی جن کے ماتھے پر بل پڑے رہتے تھے، آج وہ دیکھنے آئے تھے کہ نو وارد شعراء پر کیا بیتی ہے۔ انھیں کے ہجوم میں سجاد ظہیر، ترقی پسند تحریک کے بانی اور میر کارواں، ابھی نوعمر ہیں۔ انگلستان سے تعلیم ختم کر کے واپس آئے ہیں، جیل میں رہ چکے ہیں۔ بیماری کی وجہ سے رہا کر دیئے گئے ہیں، لیکن چہرے پر طالب علمی کی معصومیت باقی ہے، بھاری بھرکم جسم ہے، بہت نازک ہاتھ ہیں، شخصیت میں مٹھاس ہے۔ رضیہ ان کی بیوی ہیں، گندمی رنگ، چھریرا جسم، الٰہ آباد یونیورسٹی سے اردو میں ایم، اے کیا ہے۔ مایا سرکار، مہیلا ودیالے میں انگریزی پڑھاتی ہیں، بنگالی ہیں، لیکن لکھنؤ کی نفیس اردو بولتی ہیں۔ پروفیسر ڈی، پی، مکرجی بنگالی زبان کے مستند ادیب اور نقاد، موسیقی کے پرستار، شعر و شاعری کے دلدادہ، انتہائی ترقی پسند، لکھنؤ یونیورسٹی میں معاشیات اور سماجیات کی تعلیم دیتے ہیں، بولتے ہیں تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں، نفیس بنگالی دھوتی اور کرتا پہن رکھا ہے، کندھوں پر ایک کشمیری شال ہے، ہونہار طالب علموں کی تلاش میں رہتے ہیں اور انھیں اپنے گھر پر بلا کر چائے پلاتے ہیں۔ اپنی باتوں سے محظوظ کرتے ہیں، اور کتابیں پڑھنے کے لئے دیتے ہیں، اردو کم سمجھتے ہیں۔ لیکن بلا کی ذہانت ہے، اچھے اور برے شعر میں تمیز کر لیتے ہیں، انھیں خوشی ہے کہ نو وارد شعراء میں ان کی یونیورسٹی کا ایک طالب علم بھی ہے۔ احمد علی، جو ابھی ابھی انگلستان سے واپس آئے ہیں، اردو میں چند افسانے لکھے ہیں اور انگریزی میں ایک ناول جس پر فاسٹر کا دیباچہ ہے، بڑے ادیب سمجھے جاتے ہیں، گوہر سلطان جس کے گلے کی دھوم ہے، حیات اللہ انصاری اردو کے مشہور افسانہ نگار اور ہندوستان ہفتہ وار

www.taemeernews.com

کے ایڈیٹر، نئے شاعروں کے طرف دار لیکن ناقدانہ انداز لئے ہوئے۔ انور جمال قدوائی اپنے مخصوص بہکے ہوئے انداز کے ساتھ، سیاست میں عملی دلچسپی نہیں لیتے، ادب کی تخلیق نہیں کرتے، لیکن نظریاتی اور جذباتی طور سے دونوں کے معاملے میں انتہائی انقلابی اور سبط حسن، سر سے پاؤں تک عشق کا مجسمہ کسی افسانوی سرزمین کے شہزادے کی طرح جو جادو کے محلوں اور بارہ دریوں سے سوتی ہوئی شہزادیوں کو جگالاتے ہیں، حسین چہرہ، جامہ زیب جسم، نفیس ترشے ہوئے ہونٹ، بڑی بڑی بے قرار آنکھیں اور نہایت مہذب اور سلجھی ہوئی زبان۔ شاعر اُن کے دوست نہیں، درباری ہیں، ان سب کے علاوہ یونیورسٹی کے اور بھی اساتذہ اور طالب علم اور لکھنؤ کے قدیم اساتذہ، جامہ وار کی شیروانیاں پہن کر آئے ہیں اور دوزانو بیٹھے ہیں، اس سے پہلے اردو ادب کی تاریخ میں کبھی بزرگ اور معمر شعراء نوعمر شاعروں کا کلام سننے نہیں آئے تھے۔

سب ہمہ تن انتظار ہیں کہ نووارد شعراء سومناتھ چب کے ساتھ اندر داخل ہوتے ہیں۔ یہ اس عہد کے باغی ہیں، سرپھرے، عیش و نشاط کے دلدادہ مگر کفن بردوش یہ ابھی عظیم نہیں ہیں، لیکن ان کے نام افسانے بن چکے ہیں، اردو شعر و ادب کے نئے دھارے اب ان کے نام پر بہیں گے، یہ نیا جذبہ، نیا احساس، نئی زبان لے کر آئے ہیں۔ ماضی کا سارا ورثہ ان کے پاس ہے، جدید تعلیم کی اعلیٰ ترین ڈگریاں ان کے پاس ہیں، اس لئے قدیم اور جدید کا امتزاج ان کے یہاں خود بخود پیدا ہو گیا ہے، یہ پرانے ہیروں کو نئی طرح تراش رہے ہیں۔ ہجر و وصال کی داستانیں ان کو آتی ہیں۔ محبوب کے وعدۂ فردا کی لذت سے واقف ہیں۔ لیکن ہندوستان کی آزادی ان کی سب سے بڑی محبوبہ ہے اور اس محبوبہ کے سامنے نئی شاعری پر اعتراض کرنے والوں کی گردن بھی جھک جاتی ہے۔

نووارد شعراء کی طرف بے شمار نگاہیں اٹھتی ہیں، نگاہیں جن میں محبت کی گرمی ہے، نگاہیں جن میں سرد مہری ہے، عاشقانہ نگاہیں، رقیبانہ نگاہیں، لیکن ہر نگاہ میں

www.taemeernews.com

ایک سوال ہے، کون کون ہے ؟

یہ مجاز ہے۔ خوش پوش مگر چاک گریباں، آنکھوں کی گہری اداسی میں شوخی کی بجلیاں چمک رہی ہیں، اس کے باریک ہونٹوں کی نرم شریر مسکراہٹ کو لکھنؤ میں کون نہیں جانتا۔ اس کے گلے اور شعر میں بقول فیض کے مغنّی کے نغمے کا وفور ہے، جوش نے اس کی شخصیت کو ایک فقرے میں سمیٹ لیا ہے۔ "وہ ایک نگاہ میں دنیا کے سارے حسن کو اور ایک گھونٹ میں دنیا کی ساری شراب کو پی جانا چاہتا ہے" ؎

اس محفلِ کیف و مستی میں اس انجمن عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

اور یہ فیض احمد فیض ہے۔ لاہور کے گلی کوچوں کی تخلیق، چہرے کی مسکراہٹ اداس ہے، لیکن آنکھیں نرم اور محبت بھری، آواز میں ہلکا سا گداز اور شعروں میں دل کی دھیمی دھیمی آنچ جو لفظوں کے سنگیت کو پگھلا کر رنگ بنا دیتی ہے اور ہر مصرعہ ایک پینٹنگ بن جاتا ہے۔ ایک حسین و جمیل تصویر جو دل میں آویزاں ہو جاتی ہے۔ تشبیہیں اور استعارے نرم رو شعروں کے اندر بجلیوں کی طرح کوندتے ہیں۔ اور آنکھیں چکا چوند ہو جاتی ہیں، مگر یہ وہ بجلیاں ہیں، جو صرف فیض ننھے ننھے شراروں سے بنا سکتا ہے ؎

دل کے ایواں میں لئے گل شدہ شمعوں کی قطار
نورِ خورشید سے سہمے ہوئے، اکتائے ہوئے
حُسنِ محبوب کے سیّال تصور کی طرح
اپنی تاریکی کو بھینچے ہوئے، لپٹائے ہوئے

اور یہ جذبی ہے۔ سب سے بے نیاز اور سب سے الجھتا ہوا، حسّاس چہرے پر عمر بھر کے مصائب اور مفلسی کی تلخی، آنکھوں میں محبت کی بے پناہ بھوک اور حسین ترنم میں ایک دوز کیفیت جس کو اس کی آواز کی رچی ہوئی سرشاری بھی نہیں چھپا سکتی،

www.taemeernews.com

کسی کا احسان اٹھانے کو تیار نہیں ہے، زندگی کو بھی دھتکارتا ہے اور موت کو بھی ؎

نہ آئے موت خدایا تباہ حالی میں
یہ نام ہوگا غمِ روزگار سہہ نہ سکا

اور یہ مخدوم محی الدین ہے۔ حیدرآباد کا انقلابی، سنگِ اسود سے تراشا ہوا آبنوسی چہرہ، بلند پیشانی، شگفتہ آنکھیں، مسکراہٹ میں گرم جوشی اور باتوں میں بے انتہا یقین اور اعتماد، ترنم بے پناہ ہے، جس میں صرف نشاط ہی نشاط ہے۔ انقلاب اور رومان کے دوراہے پر کھڑا ہوا انتظار کر رہا ہے۔ کہنا مشکل ہے کہ یہ دکن کی کسی سانولی سلونی محبوبہ کا انتظار کر رہا ہے یا ہندوستان کی آزادی کا ؎

رات بھر دیدہ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے
پتیاں کھڑکیں تو میں سمجھا کہ آپ آ ہی گئے
سجدے مسرور کہ مسجود کو وہ پا ہی گئے
آ گئی تھی دلِ مضطر میں شکیبائی سی
بج رہی تھی مرے غم خانہ میں شہنائی سی

اور یہ جاں نثار اختر ہے۔ نو وارد شعراء کے ہجوم میں تنہا جسے شاعری اپنے والد مضطر خیرآبادی سے ورثہ میں ملی ہے، اپنے آپ سے الجھا ہوا، خود ہی سنجیدہ ہو جاتا ہے، اور خود ہی مسکراتا ہے ؎

یہ ستارے یہ لگن یہ سرد پھول
آسماں جیسے جلے لاشے کی دھول
چاند جیسے ایک بے امت رسول
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

اور یہ سردار جعفری ہے۔ کرشن چندر کا یہ کہنا ہے کہ اس کے چہرے پر ہنستے ہنستے تھوڑے

www.taemeernews.com

کا نشان ہے، پروفیسر محمد مجیب کی رائے ہے کہ وہ رنگین تصویریں نہیں بناتا بلکہ پتھروں سے بُت تراشتا ہے ؎

سرمائے کے سمٹے ہوئے ہونٹوں کا تبسّم
مزدوروں کے چہرے کی تھکن ہے کہ نہیں ہے
وہ زیرِ افق صبح کی ہلکی سی سپیدی
ڈھلتے ہوئے تاروں کا کفن ہے کہ نہیں ہے
پیشانیِ افلاس سے جو پھوٹ رہی ہے
اٹھتے ہوئے سورج کی کرن ہے کہ نہیں ہے

نووارد شعراء کے اس مشاعرے میں ن۔م۔ راشد کے بھی آنے کی خبر تھی جس کے سر اُردو شاعری میں آزاد نظم کا سہرا ہے۔ پطرس کے نزدیک وہ ایشیا کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اردو زبان راشد کو کبھی فراموش نہیں کرے گی۔

مشاعرہ ختم ہونے کے بعد جب ہم آدھی رات کو گھر واپس پہونچے تو آندھی اور طوفان کا زور کچھ اور بڑھ گیا تھا، سردی بھی بلا کی تھی۔

گھر میں فرنیچر کے نام پر ایک میز، بید کی چند کرسیاں اور مونج کے تین پلنگ تھے، انھیں کنارے سرکا کر زمین پر چٹائیوں کا فرش بچھا دیا گیا تھا، آتش دان میں آگ جل رہی تھی، اس کے اوپر کارنس تھی اور کارنس کے اوپر دیوار پر اسپین کی ایک مجاہد خاتون کی بڑی سی تصویر لگی تھی، اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں، سینہ ابھرا ہوا تھا، جس کی دوشیزگی کو فوجی لباس بھی نہیں چھپا سکتا تھا، چہرہ آسمان کی طرف اٹھا ہوا تھا اور ہونٹ شدت جذبات سے اینٹھے ہوئے تھے اور تصویر کے نیچے لکھا تھا To DEATH دو اوندھی بالٹیوں پر جلتی ہوئی موم بتیوں کی روشنی میں وہ تصویر اور بھی زیادہ پُرحوصلہ اور دل آویز معلوم ہو رہی تھی، کارنس کا سایہ تصویر کے ابھرے ہوئے سینہ تک پہونچتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ پُرجوش شکل موت کے اندھیرے سے زندگی کا

www.taemeernews.com

پیغام لے کر ابھر رہی ہے، ایک طرح وہ تصویر ہمارے رومانی اور انقلابی جذبات کی ترجمان تھی، ہم بھی موت سے نبرد آزما ہونا چاہتے تھے۔ اسپین ہمیں اپنا ملک معلوم ہوتا تھا، کیونکہ وہ فاشزم کے خلاف آزادی اور انسانیت کے حسین خوابوں کے لئے لڑ رہا تھا۔ اسپین کی آزادی اپنی آزادی تھی اور وہ مجاہد خاتون آج کی رات ہماری محفل میں شریک تھی اور ہندوستان کی آزادی کے متوالوں کا حوصلہ بڑھا رہی تھی ؎

"کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست"

کمرے میں سکون تھا۔ آگ کی اور دلوں کی حرارت تھی۔ کبھی کبھی باہر چلنے والی طوفانی ہوائیں اپنے ہزاروں ہاتھوں سے ہمارے دروازے کو جھنجھوڑ دیتی تھیں، اور کھڑکھڑاہٹ کی آواز کے ساتھ بالٹیوں پر جلتی ہوئی شمعوں کی لویں تھرتھرا جاتی تھیں۔ ہم بالٹیوں کے گرد حلقہ باندھے بیٹھے تھے اور جلتی ہوئی موم بتیوں کی نرم روشنی میں ایک دوسرے کے جذبات اور محبت سے بھرے چہروں کو دیکھ رہے تھے۔ جوش ملیح آبادی زیادہ دیر تک قبلۂ رندانِ جہاں کے فرائض انجام نہ دے سکے، رات کے جاگنے کے معاملہ میں وہ ہمیشہ کچے ہیں۔ اس لئے جب جماہیوں نے انھیں زیادہ ستایا تو وہ یہ کہتے ہوئے رخصت ہو گئے کہ رات کو جاگنا الّو کی خاصیت ہے۔

محفل کی گرمی بڑھتی گئی، دلوں کا سرور بڑھتا گیا، چہرے زیادہ روشن ہوتے گئے، اب یہ فرق کرنا مشکل تھا کہ یہ شاعری کا دور ہے، یا جاموں کی گردش۔ سب ہم عصر تھے، سب نووارد تھے، سب ایک حلقے میں بیٹھتے تھے، سب کا الگ الگ انداز تھا، انفرادیت پہچانی جاتی تھی، کسی قسم کے رشک، حسد یا معاصرانہ چشمک کا پتہ نہیں تھا، ایک دوسرے کی تعریفیں اس طرح ہو رہی تھیں، جیسے عاشق معشوق سرگوشیاں کر رہے ہوں۔ فیض نے کہا، بھئی لاہور میں ایک بہت اچھا شعر سنا تھا، معلوم نہیں کس کا ہے ؎

جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

www.taemeernews.com

جذبی کا اداس چہرہ پھول کی طرح کھل گیا۔ یہ جذبی کا شعر تھا جو اس سے پہلے لاہور پہونچ کر مشہور ہو چکا تھا۔ فیض اور جذبی گلے ملے۔ ابھی فیض کو بیٹھنے کی بھی مہلت نہیں ملی کہ جذبی نے بغیر کسی تمہید کے فیض کی نظم "موضوعِ سخن" کو اپنے بے پناہ اور انتہائی دل گداز ترنم کے ساتھ پڑھنا شروع کر دیا، جو میں نے چند ماہ قبل "نیا ادب" میں شائع کی تھی ؎

گل ہوتی جاتی ہے افسردہ سلگتی ہوتی شام
دُھل کے نکلے گی ابھی چشمۂ مہتاب سے رات
اور مشتاق نگاہوں کی سُنی جائے گی
اور اُن ہاتھوں سے مس ہونگے یہ ترسے ہوئے ہاتھ

باہر ہوائیں چنگھاڑ رہی تھیں اور اندر جذبی کا ترنم طوفان برپا کر رہا تھا۔ فیض کے چہرے پر ایک معصوم اور تشکر آمیز مسکراہٹ تھی، ایک شاعر کے لئے اس سے بہتر داد اور کیا ہو سکتی تھی۔ جذبی نے پہلا بند پڑھا تھا کہ مجاز نے دوسرا بند اٹھا لیا، اور اپنا راگ چھیڑ دیا ؎

اُن کا رخسار ہے، آنچل ہے کہ پیراہن ہے
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں
جانے ان زلفوں کی موہوم گھنی چھاؤں میں
ٹمٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں

اب دونوں نے باری باری ایک ایک بند گا کر نظم مکمل کی، جذبی کے ترنم کا تار ٹوٹنے نہیں پایا تھا کہ مخدوم کا راگ بلند ہوا۔ اس کے ہاتھ میں دیوانِ حافظ تھا جس کی ایک غزل وہ گنگنا رہا تھا ؎

شاہِ شمشاد قداں، خسروِ شیریں دہناں
کہ بہ مژگاں شکند قلبِ ہمہ شب شکناں

www.taemeernews.com

برجہاں تکیہ مکن گر قدحے می داری
شادیٔ زہرہ جبیناں خور و نازک بدناں

اس غزل نے محفل کو اور ہی رنگ دے دیا، زہرہ جبینوں اور نازک بدنوں کے نام کا جام کون نہیں پینا چاہے گا، اور اب مخدوم کی آواز تنہا نہیں تھی، سریلی اور بے سری سب آوازیں مل گئیں، حافظ کی غزل کا کورس دیر تک جاری رہا۔ دیوار پر اسپین کی مجاہد خاتون موت کی دعوت دیتی رہی، باہر ہوائیں دیوانہ وار دروازے کو کھٹکھٹاتی رہیں، مگر ہم لوگ سب سے بے نیاز حافظ شیرازی کے لفظوں میں حسینوں کے جامِ صحت پیتے رہے، نہ جانے کس کے دل میں کون سا حسین جھانک رہا تھا۔

یہ طوفان تھما ہی تھا کہ جذبی پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اب ناچ ناچ کر "موضوعِ سخن" کو گانے لگا ؎

آج پھر حسن دل آرا کی وہی سج دھج ہوگی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں وہی کاجل کی لکیر
رنگِ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلیں ہاتھوں پہ ہلکی سی حنا کی تحریر

اس کی آواز میں خستگی پیدا ہو گئی تھی، اس لئے اور بھی دلدوز ہو گئی تھی، اب وہ ایک ایک لفظ کو اتنا کھینچ کر گاتا تھا کہ سانس کا تار ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا، ہم نے بہ مشکل پکڑ کر اسے بٹھایا لیکن وہ تڑپ کر پھر کھڑا ہو گیا، فیض کی "موضوعِ سخن" پھر محفل پر چھا گئی، لیکن تھوڑی دیر بعد جذبی کی آواز نے ساتھ چھوڑ دیا، پھر بھی وہ نظم سنانے پر اصرار کر رہا تھا، اب تک فیض کی ایک ہی نظم اور وہ بھی جذبی کی زبان سے اتنی بار سنی جا چکی تھی کہ سب لوگ تھک گئے تھے، اس لئے کسی نے خیال کو دوسری طرف موڑنے کے لئے جذبی سے اس کی نئی نظم "موت" کی فرمائش کر دی اور جذبی کی ٹوٹی ہوئی آواز اور تھکے ہوئے ترنم نے اس میں ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی ؎

www.taemeernews.com

اپنی سوتی ہوئی دنیا کو جگا لوں تو چلوں
اپنے غم خانے میں اک دھوم مچا لوں تو چلوں
اور اک جامِ مئے تند چڑھا لوں تو چلوں
ابھی چلتا ہوں ذرا ہوش میں آ لوں تو چلوں

ایسا لگ رہا تھا جیسے گذرتی ہوئی رات کے ساتھ جو آندھیوں کی رفتار سے صبح کی طرف جا رہی تھی، جذبی سفر کر رہا ہے۔ نہ جانے کتنی بار اس نے یہ نغمہ سنایا، بس اتنا یاد ہے کہ جب صبح ہوتے ہوتے آندھیاں تھم گئیں، اور بالٹیوں پر جلتی ہوئی موم بتیاں چھوٹے چھوٹے سکوں میں تبدیل ہو گئیں اور ان کی تھرتھراتی ہوئی لویں دم توڑنے لگیں، اور کھانے کے لئے دسترخوان بچھا تو جذبی بیچ دسترخوان پر کھڑا ہوا گا رہا تھا۔ "اپنے بھیگے ہوئے دامن کو سکھا لوں تو چلوں"۔ آدھی سے زیادہ محفل سو رہی تھی، اور جذبی کی ڈوبتی ہوئی آواز کے ساتھ مخدوم کا اداس ترنم سنائی دے رہا تھا، جو صرف اپنے لئے گنگنا رہا تھا ؎

خلوتِ رنگیں میں بھی ڈستا ہے یوں دنیا کا حال
جیسے پیتے وقت بھوکے بال بچوں کا خیال

ایک اور رات ختم ہو گئی جو پھر کبھی نہیں آئے گی۔ ایک اور دن شروع ہو گیا، اور دیوار پر لگی ہوئی اسپین کی مجاہد خاتون کی تصویر ہمیں زندگی کی جدوجہد کی طرف چلنے کی دعوت دے رہی تھی۔

وہاں سے اٹھ کر ہم سب حیات کے میدان کی طرف نکل گئے۔ اس سفر میں جذبی کی نظم "موت" کا ایک زندہ و تابندہ شعر ہمارے ساتھ رہا ہے ؎

میری کھوئی ہوئی آواز کہاں ہے لاؤ
میرا ٹوٹا ہوا وہ ساز کہاں ہے لاؤ

www.taemeernews.com

یہ شعر اپنی شکلیں بدلتا رہا، لیکن اس کا آہنگ برقرار رہا، اور مخدوم کی شاعری میں اس طرح ابھرا ؎

برق پا وہ مرا رہوار کہاں ہے لانا
تشنہ خوں میری تلوار کہاں ہے لانا

یہ آہنگ فیض کی روح کے لئے نیا بانگ جرس تھا جو آخر عمر میں فیض کو فلسطینی مجاہدوں کے خیموں میں لے گیا۔ اسپین کی مجاہد خاتون اور فلسطین کا یاسر عرفات ایک ہی مورچے کے دو نام ہیں۔

اس مورچے پر فیض کی شرکت دوسرے مجاہدوں سے مختلف تھی، اس میں پیک اسکل Peakskill کے گیٹار بجانے والے فنکار کی شباہت تھی، جب کو کلس کلان K.K.K نے اعلان کیا کہ پال روبسن Paul Robson امریکی مزدوروں کے لئے گیت نہیں گائے گا، تو وہ سب مزدور پیک اسکل میں جمع ہو گئے اور پال روبسن کے گرد اپنے انسانی جسموں کی دیواروں سے کئی حصار بنا لئے۔ دور بلندیوں پر کو کلس کلان K.K.K ٹیلس کوپک رائفلیں Telescopic Rifles لگی ہوئی تھیں۔ ابھی یہ جنگ شروع نہیں ہوئی تھی کہ ایک پتلا دبلا گیٹار بجانے والا نوجوان آیا، کسی نے کہا میاں تم یہاں کیا کر رہے ہو، یہاں جھگڑا ہوگا، فساد ہوگا، گولیاں چلیں گی، اس نے کہا کہ مجھے جھگڑے فساد سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں امن پسند آدمی ہوں، میں تو پال روبسن کے گیت سننے آیا ہوں۔

لیکن تھوڑی دیر بعد جب وہاں میدان کارزار گرم ہوا تو یہ دیکھا گیا کہ وہ دبلا پتلا امن پسند، گیٹار بجانے والا فن کار اپنے ساز کو ہتھیار بنا کر امن، آزادی اور گیت کے دشمنوں کے خلاف شیر کی طرح لڑ رہا تھا۔

www.taemeernews.com

کچھ یہی صورتِ حال بیروت میں فیض کے ساتھ تھی، جن کے ہاتھ میں رائفل نہیں تھی، صرف شاعری کا گٹار تھا، وہ تو وہاں ایشیا اور افریقہ کے نغمے جمع کرنے گیا تھا، وہ لوٹس Lotus رسالے کا ایڈیٹر تھا۔

---

www.taemeernews.com

پانچویں رات

ہم پر ہے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ

مجاز میرے سامنے ہے، اس کے فقرے تیروں کی طرح برس رہے ہیں، اس کی ہلکی سی معصوم مسکراہٹ اور بے پناہ خلوص اور دوستی مجھے گھیرے ہوتے ہے، بائیس سال کی سینکڑوں راتیں اور سینکڑوں دن ہر طرف سے ہجوم کر رہے ہیں، رانوں کے دل میں ٹوٹے ہوتے پیمانے اور چھلکی ہوتی شراب ہے، دونوں کے ہونٹ پیاس سے سوکھے ہوتے ہیں، مایوسیاں اور مجبوریاں نوجوانی کے عزائم پر ہنس رہی ہیں، مگر نوجوانی کی ترنگ سب کو روندتی ہوتی آگے بڑھ رہی ہے، منصوبے بن رہے ہیں، کتابیں چھپ رہی ہیں، رسالے نکل رہے ہیں، کانفرنسوں اور مشاعروں پر دھاوے بولے جا رہے ہیں، کبھی مجاز نظم سنا رہا ہے اور اس کے ترنم کے جادو سے بچے اپنا کھیل بھول گئے ہیں، کبھی اس کی آواز ریشم کے ڈورے کی طرح ٹوٹی جا رہی ہے، کلکتے کی ایک شام ہے اور مجاز رو رہا ہے، بمبئی کی ایک رات ہے اور مجاز ناچ رہا ہے، لکھنؤ کی برسات کا اندھیرا ہے اور مجاز بھیگتا ہوا چلا جا رہا ہے، کوئی سیاسی جلسہ ہے اور مجاز بے انتہا سنجیدہ ہے، کوئی مشاعرہ یا ادبی جلسہ ہے، اور مجاز بہکا جا رہا ہے، ریڈیو پر اس کا نام پکارا گیا ہے اور وہ صرف ہنس رہا ہے، وہ اپنے ہزاروں رنگ روپ میں میرے

www.taemeernews.com

سامنے ہے، وہ شمشیر، جام اور ساز کا امتزاج تھا، کبھی شمشیر برہنہ ہو جاتی تھی تو ساز اور جام بھی کانپ جاتے تھے، کبھی جام چھلک اٹھتا تھا، تو شمشیر بھی ڈوب جاتی تھی۔

اور آج کی رات ۵ دسمبر ۱۹۵۵ء کی رات، جو ہزاروں راتوں کی آخری رات ہے مجاز خود ڈوبا ہوا ہے، موت کی گہری ندی میں شمشیر، ساز اور جام تیر رہے ہیں، اور مجاز ڈوبا ہوا ہے، ہمیشہ کے لئے خاموش۔ اب وہ کبھی نہیں بہکے گا۔ موت اسے کتنے دن سے بلا رہی تھی، کہیں دور آسمانوں سے آواز دے رہی تھی، اور وہ خود بھی کتنے دن سے موت کی طرف بڑھ رہا تھا۔

ضعیفی محفلِ عشرت میں خرقہ پوش آتی ہے
جوانی جب بھی آتی ہے کفن بر دوش آتی ہے

موت سے یہ دلچسپی مجاز کی رومانی فطرت ہی کی ایک شکل تھی، وہ زندگی کا ایک حسین پہلو تھی، جن کرداروں سے مجاز کو بلکہ ہم سب کو دلچسپی تھی، ان کے یہاں موت ایک خاص کیفیت رکھتی تھی، کیٹس شیلی اور بائرن یاسنن اور ازاڈورا ڈنکن، مایاکوفسکی، ارنسٹ ٹوالر اور لورکا، بھگت سنگھ، سردار چندر سنگھ گڑھوالی۔ اس کے علاوہ اسپین کا مجاذ جنگ سبا ستوپول اور اسٹالن گراد۔ بمبئی کے ملاحوں کی بغاوت، جواہر لال نہرو کا سوشلزم کا نعرہ، ہندوستانی کیونسٹ پارٹی یہ سب ہمارے شعور اور احساس کا حصہ تھے۔ اور ان کے درمیان سے مجاز اپنی رومانی فطرت کے سارے الجھاؤ اور نزاکتوں، نغموں اور نعروں کو لے کر گذر رہا تھا۔

تیس سال پہلے کا علی گڈھ۔ یونیورسٹی یونین ہال کے مشاعرے میں اسرار الحق مجاز کے نام پر ایک نوعمر چھریرے بدن کا لڑکا اٹھ کر کھڑا ہوتا ہے، میں نے اسے اس سے پہلے ٹینس کورٹ پر سفید پتلون اور قمیض میں دیکھا تھا، اس وقت اس کے جسم پر شیروانی ہے، لیکن علی گڈھ کی روایت کے خلاف وہ ننگے سر ہے۔ اور اپنے لمبے بالوں کو جھٹک کر اپنا ہاتھ پھیرتا ہے، اور اپنی نظم "انقلاب" سناتا ہے۔ شدید رومانیت۔ ایک ایک مصرعے پر

www.taemeernews.com

داد مل رہی ہے، انتہائی خوش گوار ترنم۔ جوش اور اختر شیرانی کے اثرات نمایاں ہیں لیکن ہر شعر کی تہہ سے مجاز کی اپنی انفرادیت جھلک رہی ہے ؎

اور اس رنگِ شفق میں ہا ہزاراں آب و تاب
جگمگائے گا وطن کی حریّت کا آفتاب

سارا ہال تالیوں سے گونج جاتا ہے۔

وہ یونیورسٹی کا محبوب ترین شاعر ہے، جاں نثار اختر اور جذبی بھی طالب علم ہیں، لیکن مجاز کی مقبولیت الگ ہی چیز ہے۔ ہوسٹل میں طالب علموں کے کمروں پر پروفیسروں کے گھروں میں، مشاعروں میں، جلسوں میں ہر جگہ مجاز چھایا ہوا ہے، عصمت چغتائی کا بیان ہے کہ گرلز کالج میں لڑکیاں اس کے نام کے قرعے نکالتی تھیں، اور خوش ہوتی تھیں۔

میرس روڈ پر ڈاکٹر رشید جہاں کے گھر پر محفل جمی ہوتی ہے۔ مجاز اپنی نظم سنا رہا ہے، دو چھوٹی چھوٹی بچیاں اپنے کھلونے چھوڑ کر مجاز کے پاس آ کھڑی ہوتی ہیں، ایک بچی کچھ کہتی ہے، دوسری اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے چپ کر دیتی ہے۔
"شی، گراموفون بج رہا ہے"۔

ترکی کی مشہور مجاہد خاتون اور افسانہ نگار خالدہ ادیب خانم آئی ہوئی ہیں، یونیورسٹی یونین میں ان پر پھولوں کی بارش کی جاتی ہے، اور مجاز اپنی نظم سے ان کا استقبال کرتا ہے، کمال اتاترک کے ترکی اور ہندوستان کی آزادی کی لڑائی ایک ہو جاتی ہے، خالدہ خانم اردو کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھ سکتیں لیکن وہ اس زبان کی موسیقی اور ترنم سے مسحور ہو گئی ہیں، اور اپنی تقریر میں پانچ دس منٹ تک مسلسل اردو زبان اور مجاز کی تعریف کرتی ہیں۔

دہلی میں ڈاکٹر انصاری کا گھر قومی رہنماؤں کا مہمان خانہ ہے، گاندھی جی، پنڈت نہرو، سروجنی نائیڈو سب دریا گنج میں انھیں کے گھر قیام کرتے ہیں، مجاز اس

www.taemeernews.com

گھر کا دوست اور محبوب شاعر ہے۔ شوکت اللہ انصاری اور ان کی خوب صورت بیوی زہرہ میزبانی کے فرائض انجام دیتی ہیں اور مجاز اپنی نظموں سے ان کی خاطر کرتا ہے، مسز ناٹیڈو خاص طور سے مجاز پر مہربان ہیں۔

آل انڈیا ریڈیو کا ادارہ قائم ہوتا ہے، پطرس بخاری نے ہندوستان کے بہترین شاعروں اور ادیبوں کو جمع کر لیا ہے، ذرا ذرا سے وقفے سے مجاز، ن۔م راشد، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی سب دہلی پہونچ گئے۔ مجاز ریڈیو کے سرکاری پرچے کا ایڈیٹر ہے، جس کا نام اس نے "آواز" رکھا ہے، ہر طرف سے اس خوش مذاقی کی داد ملتی ہے، ریڈیو کے کام کے علاوہ وہاں ادبی محفلیں بھی ہوتی ہیں اور معاصرانہ چشمکیں بھی ہنسی ہنسی میں پنجابی اور یوپی والوں کی صف بندیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ حفیظ جالندھری اور مجاز میں چوٹیں چلنے لگتی ہیں، حفیظ نے تفریحاً کوئی نظم کہی مجاز نے اسی موڈ میں جواب دیا، ایک شعر جو حفیظ کے متعلق تھا اس کا سب نے لطف اٹھایا ؎

وہاں کا حُسن تو سب کچھ ہے مانا
مگر خود عشق تو جالندھری ہے

لیکن یہ دوستانہ صحبتیں زیادہ دن قائم نہ رہ سکیں، معاملات نہ جانے کیسے بگڑ گئے، آخر مجاز کو ریڈیو کی ملازمت سے استعفیٰ دینا پڑا۔

اس زمانے میں مجاز کی ذاتی زندگی کا سب سے زیادہ تکلیف دہ واقعہ' اس نے عمر بھر میں صرف ایک لڑکی سے محبت کی، اور وہ بھی شادی شدہ تھی، اس لئے مجاز کی محبت خاموش تھی، لیکن شعروں سے چھلکی پڑتی تھی، وہ ہوس کی منزل تک کبھی نہ جا سکا۔ پھر بھی ایک دن اس گھر کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا، اب صرف شکستہ دلی اور بے کاری ہے، دل میں انقلاب اور بغاوت کی آگ جل رہی ہے۔ جسے شراب بھی نہیں بجھا سکتی، بلکہ اس آگ کو اور بھڑکاتی ہے، سب سے پہلے جام ان محبوب ہاتھوں

www.taemeernews.com

سے ملا تھا، جنھیں مجاز نے کبھی چھونے کی کوشش نہیں کی۔ اس کیفیت میں مجاز کی سب سے حسین اور اس عہد کی سب سے بھرپور نظم "آوارہ" کی تخلیق ہوئی جس میں مجاز کے ذاتی غم اس کے انقلابی احساسات کے ساتھ مل کر ایک ہو گئے ہیں ؎

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارہ پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک دربدر مارا پھروں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

یہ نظم نوجوانوں کا اعلان نامہ تھی اور آوارہ کا کردار اُردو شاعری میں بغاوت اور آزادی کا پیکر بن کر ابھر آیا، اس سے پہلے یہ لفظ صرف پریشان حال اور پریشان روزگار کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا، اور بگولوں کی طرح مارا مارا پھرتا تھا مگر اب یہ بھی سوچتا ہے ؎

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے، میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

کسی ترقی یافتہ زبان کی شاعری کو جس کے پاس پانچ سو برس کی روایت ہو، کوئی نیا تصور دینا معمولی بات نہیں ہے۔ یہ شاعر کو زندۂ جاوید کر دینے کے لئے کافی ہے۔

روزگار اور محبوبہ دونوں کو مجاز نے جس طرح کھویا، اس کے لکھنے کا وقت ابھی نہیں آیا ہے۔ (اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں) لیکن اس کے زیر اثر اس کی حساس شخصیت ٹوٹنے لگی، اس کا ذہنی توازن بگڑنے لگا، یہ کہنا غلط ہے کہ شراب نے اس کے ذہنی توازن کو خراب کیا، حقیقت یہ ہے کہ ایک شکستہ شخصیت کو ذہنی توازن کی کمی نے شراب میں غرق کر دیا، چار پانچ سال تک اس نے اپنی ٹوٹی ہوئی شخصیت کو

www.taemeernews.com

سینے رکھنے کی کوشش کی، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ وہ بکھرتی گئی، اور مجاز ایک ناتمام گیت بن کر رہ گیا، ان رسالوں میں اس نے بعض بہت اچھی نظمیں کہیں "خواب سحر" ایک یادگار نظم ہے، جس میں مجاز کے شعور کی پختگی جھلک رہی ہے، "شہر نگار" اس کی سرشاری کی ایک اور جھلک ہے، "اندھیری رات کا مسافر" اپنی ٹوٹی ہوئی شخصیت کو دوبارہ جوڑنے کی ایک دردناک کوشش ہے۔ ہر مشکل کے باوجود اپنی منزل کی طرف بڑھنے کی خواہش اس نظم میں ایک دلفریب کیفیت پیدا کرتی ہے۔

وہ اپنی شراب نوشی کی زیادتی سے بہت پہلے مر چکا تھا، شاعر کی جسمانی موت کوئی معنی نہیں رکھتی، مجاز کی موت کی آخری ہچکی وہ نظم ہے، جسے اس نے "اعتراف" کا نام دیا ہے، مجاز نے اپنے عشق اور شاعری دونوں کو ہوس کی آلائش سے ہمیشہ پاک رکھا، اس نے عشق کی ناکامی کے بعد بھی محبوب پر طنز نہیں کیا، جب ترقی پسند شاعری میں یہ رویہ عام تھا کہ "تو میری جان میرے ساتھ کہاں جائے گی"۔ "مجھ سے پہلی سی محبت میری محبوب نہ مانگ"۔ "نہ کر خدا کے لئے میرا انتظار نہ کر"۔ اس وقت بھی مجاز کے یہاں عاشق اور معشوق کے درمیان روٹی نہیں تھی ؎

آؤ مل کر انقلاب تازہ تر پیدا کریں
دہر پر اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

کیونکہ عام زندگی اور آزادی کی جدوجہد دونوں میں وہ عورت کے حقوق کا حامی تھا اس لئے اس کا آنچل مجاز کے لئے پرچم تھا، اور ماتھے کا ٹیکہ مرد کی قسمت کا تارہ۔ اور یہ تصور بھی اردو شاعری میں جواب عام ہے پہلی بار مجاز کے ذریعے سے آیا، لیکن اپنی نظم "اعتراف" میں اس نے اعتراف شکست کر لیا۔ "اب میرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو"۔ یہ نظم ایک مجروح جوانی کی آخری پکار تھی جس میں جذبۂ شوق کی موت کا اعلان تھا ؎

وہ گدازِ دلِ مرحوم کہاں سے لاؤں
اب میں وہ جذبۂ معصوم کہاں سے لاؤں

www.taemeernews.com

اور جس دن جذبے کی معصومیت ختم ہو جاتی ہے، اس دن شاعر اور شاعری دونوں کا جنازہ نکل جاتا ہے، اس کے بعد مٹی میں دفن ہونا اور شراب میں غرق ہونا برابر ہے۔

۱۹۵۲ء میں کل ہند تہذیبی کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے مجاز، ڈاکٹر سیف الدین کچلو کے ساتھ کلکتے آیا۔ اس وقت اس کی دیوانگی اپنے شباب پر تھی، وہ روز شام کو شراب پینے کے لئے مجھ سے پانچ روپے لیتا تھا، اس سے پہلا جام آجاتا تھا، باقی جاموں کا انتظام میخانے میں آنے والے کر دیتے تھے۔ ایک روز مجاز نے دس روپے مانگے، میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو کہنے لگا، "سردار تمہارے بیوی بچے ہیں، گھر ہے، شاعری کرتے ہو، میرے پاس کیا ہے۔ اب شراب بھی نہیں پینے دیتے۔

میرے خیال میں یہ سوال مہمل ہے کہ کیا وہ اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکتا تھا، ذہنی اور جسمانی قوت برداشت کی حدیں ہوتی ہیں۔ بعض لوگوں کے اعصاب فولاد کے ہوتے ہیں، بعض کے اعصاب گوشت پوست کے۔ مجاز کے اعصاب شیشے کی طرح نازک تھے اور ذرا سی ٹھیس میں چٹخنے لگتے تھے، وہ جس کی بذلہ سنجی مشہور ہے جس کی حاضر جوابی ضرب المثل ہے، جس کے لطیفوں میں بھی شاعرانہ لطافت اور ذہانت ہے، کبھی سخت بات کا جواب نہیں دے پاتا تھا، جب دوستوں نے اس سے بدسلوکی کی ہے تو میں نے مجاز کو خاموش دیکھا ہے، اس کی زبان پر کبھی کسی کی شکایت نہیں آئی تھی، معاصرانہ چشمک کا دور دور پتہ نہیں تھا، ایک شاعر کی شاعری ناپسند تھی، تو ہنس کر کہا "فکر مت کرو، جب تمہاری نظموں کا اردو ترجمہ ہو گا تب لوگ تمہیں پہچانیں گے"، انقلابی صفوں میں آگے آگے رہنے کی خواہش کے باوجود دل کی نزاکت کا یہ عالم تھا کہ ۱۹۴۶ء کے فرقہ وارانہ فسادات میں ایک آدمی کو بمبئی میں قتل ہوتے دیکھ لیا، تو تین دن تک کھانا نہیں کھا سکا، جس زمانے میں وہ سائنس کا طالب علم تھا تو میز پر مینڈک دیکھ کر وہ کلاس سے بھاگ گیا اور سائنس کی تعلیم ترک کر دی۔

اس کی شاعری میں ذاتی غموں کی پرچھائیاں کم ہیں، جس زمانے میں اس پر

www.taemeernews.com

غم، تکلیف اور اداسی کے بادل چھا جاتے تھے، تب بھی اس کی شاعری شگفتہ رہتی تھی، وہ اپنے زخموں کی نمائش نہیں کرتا تھا، اور اپنے دکھوں کا ماتم سب کے سامنے نہیں کرتا تھا۔ اس سے زیادہ وہ کبھی اپنے دکھ نہیں بیان کر سکا کہ "سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے"۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد سارا بوجھ دل ہی پر پڑا رہے گا۔ اس حالت میں اعصاب کا چٹخ جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

جگر مرادآبادی نے ایک بار شراب ترک کرنے کے لئے کہا تو مجاز نے ہنس کر جواب دیا کہ "آپ نے صرف ایک بار شراب چھوڑی ہے، اور میں کئی بار چھوڑ چکا ہوں"، لیکن جوش ملیح آبادی کی نصیحت ناگوار گذر گئی، کیونکہ وہ نظم میں تھی جسے جوش نے شائع کر دیا، اسی زمانے میں جوش نے شیخ عبداللہ کی تعریف میں ایک نظم کہی تھی۔ مجاز نے ان دونوں واقعات کو ایک قطعے میں نظم کر دیا، جس کے آخری مصرعے ہیں ؎

رندِ برباد کو نصیحت ہے
شیخ کی شان میں قصیدہ ہے

اس کے ساتھ ایک اور قطعہ بھی کہا تھا، جس میں جوش کی سرکاری ملازمت اور انقلابی شاعری کے تضاد کی طرف اشارہ تھا ؎

سینۂ انقلاب چھلنی ہے
شاعرِ انقلاب کیا جانے

یہ ٹھیس کچھ ایسی لگی تھی کہ مجاز آخر وقت تک اسے نہیں بھول سکا، دیوانگی کے آخری زمانے کے کاغذات میں جو رانچی کے پاگل خانے کی یادگار تھے، جو نامکمل چیزیں برآمد ہوئیں ان میں یہ مصرعہ بھی تھا۔ ؏

فراق ہوں اور نہ جوش ہوں میں، مجاز ہوں سرفروش ہوں میں

اس نظم کے ایک مصرعے میں اس نے اپنی ذہنی کیفیت بھی بیان کر دی تھی ؏

وہ ریگ زارِ خیال میں ہے کبھی کبھی ہم خرام میری

www.taemeernews.com

مجاز جو تر و تازہ الفاظ کا بادشاہ تھا، اب اپنی محبوبہ کے ساتھ ذہنی ریگ زار میں گھوم رہا تھا، شاید دیوانے ذہن کے لئے اس سے بہتر لفظ نہیں ملے گا۔ ان کاغذات میں ماضی کی یادیں بھی بکھری ہوتی ہیں"۔ کیا قیامت ہے کہ اک دوست رقیب آج بھی ہے"۔ ناموزوں، مہمل اور بے معنی مصرعے بھی ہیں۔ جو اس بات کی شہادت دیتے ہیں سنہ ۱۹۵۲ء تک مجاز کے دل و دماغ ٹکڑے ٹکڑے ہو چکے تھے، وہ سراپا نظم شاعر جس کے مصرعوں میں کبھی جھول نہیں پڑتا تھا، جو الفاظ کے پیروں میں گھنگھرو باندھ دیتا تھا، اب مکمل نظم تو درکنار مکمل مصرعہ کہنے پر بھی قادر نہیں رہ گیا تھا، مجاز کے ساتھ ساتھ ایک اور باغی شاعر رانچی کے پاگل خانے میں کلکتے سے آیا تھا، اور یہ وہ تھا جس نے اردو کی ترقی پسند شاعری پر اثر ڈالا تھا، ایک کاغذ پر لکھا ہے "عطیہ قاضی نذر الاسلام" اور اس کاغذ کو مجاز نے بہت سنبھال کر اپنے بکس میں بند کر لیا تھا۔

جب طالب علموں کی ایک ادبی کانفرنس کے لئے ۳ر دسمبر سنہ ۱۹۵۵ء کی صبح کو ہم بمبئی سے لکھنؤ پہونچے تو ہمیں مجاز کی ذہنی کیفیت اور صحت کا پورا اندازہ تھا، اور ایک نامعلوم خوف ہمارے دل میں بیٹھا ہوا تھا، عصمت چغتائی اور ساحر لدھیانوی بھی ساتھ تھے، ہمیں معلوم تھا کہ مجاز شراب نہیں زہر پیتا ہے، اور میں نے اور ساحر نے طے کیا کہ کم سے کم دو تین دن تک ہم مجاز کو لکھنؤ کے دوستوں سے بچائے رکھیں گے۔

مجاز اسٹیشن نہیں آیا، اپنے گھر پر بھی نہیں تھا، شام کو پانچ چھ بجے کے قریب مجھے حضرت گنج میں مل گیا، اسی محبت اور تپاک سے ملا اور کہنے لگا ؎

ہمدم یہی ہے رہ گذرِ یارِ خوش خرام
گذرے ہیں لاکھ بار اسی کہکشاں سے ہم

ہم دونوں ساتھ ساتھ طالب علموں کی ادبی کانفرنس کے لئے قیصر باغ کی

www.taemeernews.com

بارہ دری پہونچے"۔ دوستوں نے مجاز کو بہت گھیرنے کی کوشش کی، لیکن میں کسی طرح بچا کر نکال لانے میں کامیاب ہو گیا، رات کو مشاعرے میں مجاز نے بڑی سنجیدگی کا ثبوت دیا، معلوم ہوتا تھا، برسوں پرانا مجاز زندہ ہو گیا ہے، مجھ سے کہا "نہ جانے پھر کب ملاقات ہو"۔ اور یکے بعد دیگرے کئی چیزیں سنائیں، مجمع حیران تھا اور خوش تھا، مجاز لہک رہا تھا، آخری چیز ایک غزل تھی، اس کے دو شعر بار بار پڑھے ؎

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا
تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے
بہ ایں سیل غم و سیل حوادث
مرا سر ہے کہ اب بھی خم نہیں۔ ہے

شعر کی خوبی کے علاوہ مجاز کے حالات کے پیش نظر آخری مصرعے کی بہت داد ملی، اگر وہ صبح تک سناتا رہتا تو بھی لوگ سنتے رہتے۔

دوسرے دن ۴ر دسمبر کو مجاز ہوٹل میں ہمارے ساتھ رہا، ساحر نے اس کے لئے نفیس وہسکی کی بوتل خرید لی تھی، مجاز سے وعدہ لیا گیا تھا کہ وہ دن میں نہیں پیئے گا، اور شام کو لکھنؤ کے "دوستوں" کے ساتھ باہر نہیں جائے گا، اور خود اس کے مشورے سے بوتل الماری میں بند کر دی گئی تاکہ دن میں نیت نہ خراب ہو، وہ بڑی دیر تک مجھ سے پرانی باتیں کرتا رہا۔ پھر رات کی بات دہرائی، "زیادہ وقت میرے ساتھ گزارنا، نہ جانے پھر کب ملاقات ہو"۔

تیسرے پہر ہم لوگ کانفرنس کے اجلاس اور چائے کی ایک دعوت کے لئے چلے گئے اور مجاز کمرے میں سوتا رہا، شام کو واپسی میں ذرا دیر ہو گئی، اور اس عرصے میں مجاز کے لکھنؤ کے "دوست" اسے اڑا لے گئے، میں نے اور ساحر نے بہت تلاش کیا، لیکن اس کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

۵ر دسمبر کو بھی کانفرنس کا اجلاس تھا، خیال تھا کہ مجاز ضرور شریک ہو گا لیکن

www.taemeernews.com

وہ نہیں آیا، اب ہماری پریشانی بڑھ گئی، آخر شام کو پانچ بجے کے قریب کسی نے آکر یہ وحشت ناک خبر سنائی کہ مجاز بلرام پور ہسپتال میں بے ہوش پڑا ہے۔ اس خبر کے ساتھ ہی کانفرنس کا اجلاس ملتوی کر دیا گیا، اور ہم لوگ بلرام پور اسپتال پہونچے۔ مجاز بستر پر بے ہوش پڑا تھا، اور اس کی ناک میں آکسیجن کی نلکی لگی ہوئی تھی، نرسوں اور ڈاکٹروں نے مایوسی کا اظہار کیا۔

بہ مشکل گذشتہ رات کی تفصیلات معلوم ہوئیں، ہماری عدم موجودگی میں مجاز کے "دوست" اسے ہوٹل سے نکال کر لال باغ کے ایک تاڑی خانے میں لے گئے، جہاں لکھنؤ کی سردی کی رات میں کھلی چھت پر بیٹھ کر سب نے تاڑی پی اور پھر مستی کے عالم میں اٹھ اٹھ کر چلے گئے۔ مجاز وہیں رہ گیا اور ساری رات کھلی چھت پر پڑا ہوا سردی کھاتا رہا، صبح تاڑی خانہ والوں نے دیکھا تو وہ بے ہوش تھا، پولیس نے اسے اسپتال منتقل کیا، جہاں ڈاکٹروں نے بتایا کہ دماغ کی رگیں پھٹ چکی ہیں، اور سردی میں پڑے رہنے کی وجہ سے نمونیہ ہو گیا ہے، بچنے کی کوئی امید نہیں۔

اسی رات مجاز کا انتقال ہو گیا، اس کے سرہانے اس کی شاعری کی شیدائی ایک طالب علم لڑکی بیٹھی تھی جو اس کی محبوبہ کی ہمنام تھی۔

گھر واپس نہ پہونچنا مجاز کی برسوں پرانی عادت تھی۔ اس کی ماں روز رات کو اس کے بستر کے سرہانے ایک میز پر کھانا، قینچی سگریٹ کی ایک ڈبیہ اور اٹھنّی رکھ دیتی تھیں تاکہ مجاز کسی عالم میں آئے اسے تکلیف نہ ہو، رکشا والے بھی واقف تھے، اور وہ اکثر مجاز کو گھر پہونچا کر بستر پر لٹا دیتے تھے، اور سرہانے رکھی ہوئی اٹھنی اٹھا لے جاتے تھے۔

آج جب ہم اس کی لاش لے کر اس کے گھر پہونچے تو چارپائی کا رخ بدلا ہوا تھا، سرہانے میز پر کھانا نہیں تھا، تکیہ کے پاس قینچی سگریٹ کی ڈبیہ اور اٹھنی بھی نہیں تھی، پلنگ کے پاس زمین پر بیٹھی ہوئی بوڑھی ماں اس کا انتظار کر رہی تھیں، برسوں کا

www.taemeernews.com

کھویا ہوا بیٹا گھر واپس آگیا تھا ہمیشہ کے لئے۔

مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے اپنے پرانے شاعر طالب علم کو آخری اور سب سے بڑا خراج عقیدت اس طرح پیش کیا کہ اس طالب علمی کے زمانے کی ایک نظم کو یونیورسٹی کا سرکاری ترانہ بنا لیا۔

مجاز کی قبر پر اس کا اپنا ایک شعر لکھا ہے ؎

اب اس کے بعد صبح ہے اور صبح نو مجاز
ہم پر ہے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ

(بمبئی، ستمبر، اکتوبر ۱۹۶۴ء)

www.taemeernews.com

چھیرو مانجھی

ہوا بہت دھیمے سروں میں گا رہی تھی، دریا کا پانی آہستہ آہستہ گنگنا رہا تھا، تھوڑی دیر پہلے یہ نغمہ بڑا پر شور تھا، لیکن اب اس کی آخری تانیں مدھم پڑ چکی تھیں، اور ایک نرم اور لطیف گنگناہٹ باقی رہ گئی تھی، وہ لہریں جو پہلے ساحل سے جا کر ٹکرا رہی تھیں، اب اپنے سیال ہاتھوں سے تھکے ہوئے ساحل کا جسم سہلا رہی تھیں، ہماری کشتی بڑی نرمی کے ساتھ بہہ رہی تھی، کنارے سے دور آ کر بیچ دریا میں ماہی گیروں نے اپنے چپو چھوڑ دیئے تھے اور بادبان کھول دیئے تھے اور سمندر کی طرف دوڑتی ہوئی موجیں کشتی کو بہائے لئے جا رہی تھیں، بادبان میں ہوا بھری ہوئی تھی، اور اس کا سینہ غرور سے پھولا ہوا تھا، ہماری کشتی لمبی لمبی نازک اور پتلی سمپانوں کو، ان میں بیٹھے ہوئے مانجھیوں کے گیتوں کو بڑے سے سیاہ فام جہاز کو اور ساحل کے پاس شہر کی چمکتی ہوئی روشنیوں کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھتی جا رہی تھی، سمپانیں موجوں میں، ساحل اندھیرے میں اور روشنیاں ننھے ننھے خوب صورت ستاروں میں تبدیل ہوتی جا رہی تھیں

بوڑھے ماہی گیر نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا، "رات اچھی ہے، آج طوفان کا خطرہ نہیں ہے، ایک گھنٹے میں چاند نکل آئے گا۔"

نوجوان ماہی گیر نے جو اس کا بیٹا تھا کہا کہ "اتنی دیر میں ہم کھلے سمندر میں

www.taemeernews.com

پہونچ جائیں گے۔"

یہ وہ جگہ تھی جہاں دریائے کرنافلی خلیج بنگال میں جاکر ملتا ہے، جس کے کنارے چٹ گاؤں کا شہر آباد ہے، سبز اور نیلی پہاڑیوں کے دامن میں، سپاری کے خوبصورت اور چھریرے بدن کی دوشیزاؤں کی طرح نازک درختوں کے سائے میں، جب سمندر میں پانی چڑھتا ہے تو دریا کا دھارا الٹے بہنے لگتا ہے۔ اور ماہی گیر اپنے جال پانی میں ڈال دیتے ہیں، جب سمندر کا پانی اترتا ہے تو دریا پھر سمندر کی پھیلی ہوئی آغوش کی طرف لپکتا ہے۔ اور ماہی گیر اپنی کشتیاں اور جال لے کر کھلے سمندر میں چلے جاتے ہیں۔ اور ساحل کے کنارے کنارے کوکس بازار تک مچھلیاں پکڑتے ہیں، گھروں پر ان کی بیویاں اور محبوبائیں ان کا انتظار کرتی ہیں اور سمندر میں ان کے گیت تیرتے ہیں جنھیں سننے کے لئے دور دور کی مچھلیاں سمٹ آتی ہیں، اور ان کے جال بھر جاتے ہیں۔ اور کشتیاں بھاری ہو جاتی ہیں۔ اور وہ اپنے مضبوط بازوؤں کی قوت سے چپو چلاتے ہیں، ان کی سانس پھول جاتی ہے، گیتوں کی تان وزنی ہو جاتی ہے۔ گلے کی رگیں ابھر آتی ہیں، بازوؤں کی مچھلیاں تڑپنے لگتی ہیں۔ ہتھیلیاں لال ہو جاتی ہیں اور جب وہ اپنے گاؤں کے کنارے آکر شکار سے بھری کشتیوں کو خالی کرتے ہیں۔ تو ان کی بیویوں، اور محبوباؤں کی آنکھیں رنگ برنگی مچھلیوں کو دیکھ کر چمک اٹھتی ہیں اور وہ اپنا دل ہمیشہ کے لئے اپنے بہادر ماہی گیروں کو دے دیتی ہیں۔ اور رات کو جب تیل کی کمی سے چراغ کی مدھم لو ٹمٹمانے لگتی ہے اور ہوا کی ہلکی سی پھونک اسے بجھا دیتی ہے۔ تو یہ تھکن سے چور ماہی گیر ان کے نیلگوں سینوں پر جن میں مچھلی کی بو آتی ہے، اپنا سر رکھ کر سو جاتے ہیں۔

لیکن جب سے لڑائی شروع ہوئی تھی اور جاپان نے ہندوستان پر حملہ کر دیا تھا، تب سے ماہی گیروں کو عام طور سے سمندر میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ کھلے سمندر میں جانے کے لئے انھیں فوجی افسروں سے اجازت نامہ حاصل کرنا پڑتا تھا،

www.taemeernews.com

جو صرف چند امیر ماہی گیروں کو ملتا تھا، کیونکہ دوسرے ماہی گیر رشوت دینے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے۔ کوکس بازار جانے کے تمام راستے بالکل بند ہو گئے تھے، کیونکہ وہ بندرگاہ بہت بڑی چھاؤنی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ سڑک سے صرف فوجی لاریاں گذرتی تھیں، اور سمندر سے صرف جنگی جہاز۔ مجھے اخباری نمائندے کی حیثیت سے خاص اجازت نامہ ملا تھا جس پر فوجی افسروں کے علاوہ چٹ گاؤں کے ڈپٹی کمشنر کی بھی مہر لگی ہوئی تھی۔

بوڑھے ماہی گیر نے اپنی چلم سلگائی، نوجوان ماہی گیر مانجھیوں کا گیت گانے لگا، میں کشتی میں لیٹ کر خواب دیکھنے لگا۔ میری نگاہیں دور تک سر پر سے گذرنے والے ہوائی جہازوں کی سرخ اور سبز روشنیوں کا تعاقب کرتیں، اور پھر آسمان پر بکھرے ہوئے ستاروں میں کھو جاتیں جو نیلے آسمان کی گود میں دریا کی موجوں کی طرح بہہ رہے تھے۔

بوڑھا ماہی گیر میرے پاس سرک آیا، اور چلم میری طرف بڑھا دی، میں نے ایک لمبا سا کش لے کر پوچھا: "تم اپنا جال ساتھ لاتے ہو؟"

"نہیں، جال کیا ہوگا، جب سے لڑائی شروع ہوئی ہے، سمندر میں جال ڈالنے کی اجازت نہیں ہے۔"

"کیوں نہیں ہے؟"

"کہتے ہیں پانی میں بڑے بڑے بم ڈال دیئے گئے ہیں تاکہ دشمن کے جہاز نہ آسکیں اور میں سوچتا ہوں کہ سرکار کے جہاز کیسے چلتے ہیں۔"

"بم تو سرکار ہی نے ڈالے ہیں۔" بیٹے نے اپنا گیت بند کر کے جواب دیا۔ "انھیں معلوم ہے کہ بم کہاں کہاں پڑے ہیں اور وہ اپنے جہازوں کو بچا کر نکال لے جاتے ہیں۔"

"ہم تو تباہ ہو گئے۔" بوڑھے نے اپنی داستان شروع کی، رات کے اندھیرے میں اس کا جھریوں پڑا چہرہ بڑا پر وقار معلوم ہو رہا تھا، جس پر پچاس برس کے

www.taemeernews.com

صعوبتوں کے نشان تھے۔

"پچاس برس سے دریا میں جال ڈال رہا ہوں، اس کے ایک ایک چپے کو جانتا ہوں، بہتی ہوئی موجوں کو دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ اس کے نیچے کتنی مچھلیاں ہیں، سمندر کی مچھلیاں اور دریا کی مچھلیاں دو طرح کی ہوتی ہیں، جب وہ چلتی ہیں تو موجوں کی رفتار میں فرق آجاتا ہے، اور میں ایک نظر میں بھانپ لیتا ہوں کہ کون سی مچھلی جا رہی ہے آسمان کو دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ موسم کتنی دیر میں بدل جائے گا، سمندر میں طوفان کب آئے گا، اور دریا پانی الٹا کب بہے گا، پچاس برس سے یہی کام کر رہا ہوں، کچھ نہیں تو لاکھوں ہی مچھلیاں تو پکڑ ڈالی ہونگی، لیکن آج تک یہ پتہ نہ چلا کہ ہم جو محنت کرتے ہیں، وہ دولت کہاں جاتی ہے۔ ہم دریا میں خالی جال ڈالتے ہیں، جب اسے کھینچتے ہیں، تو اس میں چاندی بھری ہوتی ہے، تڑپتی ہوئی چاندی جو جھلمل جھلمل چمکتی ہے۔ عورتیں اس چاندی کو اپنی ٹوکریوں میں بھر کر بازار لے جاتی ہیں اور اس کے بدلے تانبے کے پیسے، گلٹ کے روپے اور کاغذ کے ٹکڑے لے آتی ہیں، ہم پھر دریا میں جال ڈالتے ہیں، اور پھر اس میں سے تڑپتی ہوئی چاندی باہر نکالتے ہیں اور یہ چاندی پھر تانبے، گلٹ، اور کاغذ میں تبدیل ہو جاتی ہے، اور ہمارے جسم سوکھتے چلے جاتے ہیں، اور آنکھیں دھنستی چلی جاتی ہیں اور ہاتھ پاؤں لکڑی کی طرح خشک ہوتے جاتے ہیں، میں پچاس برس سے چٹ گاؤں کے بازاروں کے لئے دریا سے چاندی نکال رہا ہوں لیکن مجھے تانبے اور گلٹ کے ٹکڑوں اور کاغذ کے میلے پرزوں کے سوا کچھ نہ ملا اور وہ بھی میرے پاس نہیں رہے، جیسے زندہ مچھلیاں تڑپ کر نکل جاتی ہیں یہ ٹکڑے بھی ہماری ہتھیلیوں سے پھسل جاتے ہیں اور ہماری مفلسی پہلے سے بھی زیادہ بھیانک ہو جاتی ہے"۔

نوجوان ماہی گیر باپ کی داستانِ غم سے بے نیاز کشتی کے اگلے سرے پر بیٹھا ہوا ایک عشقیہ گیت گا رہا تھا۔

بوڑھے نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "تم پڑھے لکھے ہو، بہت سے

www.taemeernews.com

دیس دیکھے ہوں گے، تم جانتے ہوگے کہ ہماری دولت کہاں جاتی ہے"۔

میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن بوڑھے ماہی گیر نے اس کا موقع نہیں دیا اور بہتی ہوئی موجوں کی طرف دیکھ کر اپنے سوال کا جواب دینے لگا، جیسے وہ سب کچھ جانتا ہے۔

"یہ دریا ہزاروں برس سے بہہ رہا ہے اور اس کا پانی سمندر میں گر رہا ہے، میری عمر ساٹھ برس کی ہونے کو آئی، لیکن میں نے ایک دن بھی نہیں دیکھا کہ اس کی موجوں کا بہاؤ رک گیا ہو، ایک کے پیچھے دوسری موج دیوانہ وار سمندر کی طرف چلی جا رہی ہے سمندر جس کی تہہ کا کچھ پتہ نہیں جو آکاش کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ ہماری محنت بھی اسی طرح بہتی ہوئی کسی بڑے سے سمندر کی طرف چلی جا رہی ہے، کوئی اندھا سمندر ہے جو ہماری چاندی کی طرح چمکتی محنت کو نگلے لے رہا ہے، چاندی ہی تو ہے جو بہہ رہی ہے دیکھو یہ موجیں چاندی کی طرح چمک رہی ہیں، دریا کا رنگ سفید ہے اور سمندر کا رنگ نیلا۔ اور یہ سفید چاندی نیلے سمندر میں جا کر کھو جاتی ہے"۔

میں نے موجوں کی طرف دیکھا جو واقعی بہتی ہوئی چاندی کی طرح چمک رہی تھیں، ہمارے بائیں طرف دور افق میں مہینے کی آخری راتوں کا چاند ابھر رہا تھا، جس کی نرم کرنیں فضا سے گذر کر دریا کے جسم پر پھیل گئی تھیں، اور مٹیالے پانی کو سیال چاندی میں تبدیل کر رہی تھیں، بوڑھے کا سیاہی مائل چہرہ چاند کی ہلکی سی سرخ مائل روشنی میں چمک اٹھا تھا اور سفید بادبان بادل کا ایک خوب صورت ٹکڑا معلوم ہوتا تھا، جو ہمیں چاندی کے دریا میں بہائے لئے جا رہا تھا۔

بوڑھے ماہی گیر نے نظر اٹھا کر چاند کی طرف دیکھا پھر بادبان کی طرف۔ بادبان کچھ ٹیڑھا ہو گیا تھا، یا شاید ہوا کا رخ بدل گیا تھا، اور اس لئے بادبان کا بھی رخ بدلنا ضروری تھا، اس نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔ دونوں نے لپٹی ہوئی رسیاں کھولیں، اور بادبان کا رخ بدل کر میرے پاس آ بیٹھے۔

"جب سے لڑائی شروع ہوئی ہے، مفلسی اور بڑھ گئی ہے، پہلے قحط پڑا پھر

www.taemeernews.com

وبائیں پھیلیں۔ ایسا قحط اور ایسی وبائیں تو میں نے دیکھی نہیں تھیں، ہیضہ اور پھر کالا آزار۔ پھر بدچلنی، ہمارے گاؤں کے گاؤں اجڑ گئے۔ بوڑھے اور بچے مر گئے۔ لڑکے آوارہ ہو گئے، اور لڑکیاں گھر بار چھوڑ کر چلی گئیں، پھر یہاں فوج آ گئی، اور ہمارے لڑکے اور لڑکیاں ماہی گیری چھوڑ کر فوج میں مزدوری کرنے لگے، ماہی گیری کیسے کرتے، نہ جال تھے نہ کشتیاں سر چھپانے کے لئے گھر بھی نہیں تھا، یہ سب چیزیں تو قحط ہی کے زمانے میں بک چکی تھیں۔ اب لڑکے بے حیا ہو گئے ہیں، لڑکیاں اور بھی زیادہ بے شرم ہو گئی ہیں۔ سپاہی انھیں روپے دیتے ہیں اور وہ سپاہیوں کو اب کیا کہوں کیا دیتی ہیں، پہلے انھیں جال کی مرمت کرنی پڑتی تھی، سر پر مچھلیوں کی ٹوکری رکھ کر بازار جانا پڑتا تھا۔ پیٹ بھر کھانا نہیں ملتا تھا تو کیا۔ محنت سے جسم تندرست رہتے تھے، چہرے پر ایمانداری کی چمک ہوتی تھی، اور اب؟ اب کیا ہے۔ ذرا سی آنکھیں مٹکائیں۔ ذرا سا کولھا چلایا اور کام بن گیا، مجھی کو دیکھو، میرے گاؤں میں تین سو گھر تھے، اب صرف آٹھ گھر رہ گئے ہیں باقی سب اجڑ گئے، اب ان کھنڈروں میں بیٹھ کر کتے روتے ہیں، میری بیوی قحط میں مر گئی، دو بیٹیاں تھیں وہ گھر سے بھاگ گئیں، اب سنا ہے کہ اراکان روڈ پر مزدوری کر رہی ہیں، مزدوری تو کیا کر رہی ہوں گی، یہ تو بہانا ہے۔ ایک کا نام رادھا ہے اور دوسری کا ساوتری۔ یہ نام تمہیں اس لئے بتا رہا ہوں کہ تم گھومنے پھرنے والے آدمی ہو، شاید تمہیں اراکان روڈ پر وہ لڑکیاں مل جائیں تو ان سے کہہ دینا کہ تمہارا باپ زندہ ہے، نیا جھونپڑا ڈال لیا ہے، جال بھی ہے اور کشتی بھی، اور دریا میں بہت سی مچھلیاں ہیں۔ رادھا اور ساوتری آ جائیں، تو ہم خوب مچھلیاں پکڑیں گے، ہمارا ایک جال بھی ٹوٹا پڑا ہے، اس کی مرمت ان کے بغیر کیسے ہو گی۔"

بوڑھے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے... وہ چپ ہو گیا اور بہتے ہوئے پانی کی موجیں گننے لگا، جیسے وہ ان موجوں کے آئینے میں اپنی ساری گذری ہوئی زندگی کا

www.taemeernews.com

عکس ڈھونڈ رہا تھا، اس کی ایک جھلک دیکھنا چاہتا تھا، اس کا اجڑا ہوا گاؤں، مرے ہوئے ساتھی، بیوی جو داغِ مفارقت دے گئی۔ گھر چھوڑ کر بھاگ جانے والی بیٹیاں جو اسے اب بھی اتنی ہی پیاری تھیں، وہ سب ان موجوں میں تیر رہی تھیں، میں نے دیکھا کہ بوڑھے ماہی گیر کی انگلیاں کانپ رہی ہیں اور آنکھوں سے بہہ کر آنسو اس کی جھریوں میں بھر گئے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہنے لگا، "رادھا اور ساوتری ہی کو کیوں برا کہو، آج کل سب لڑکیاں ایسی ہی ہو گئی ہیں۔ ہمارے یہاں کالے گورے ہزاروں سپاہی آ گئے ہیں، وہ لڑکیوں کے لئے موزے لاتے ہیں، سفید اور لال رنگ سے بھرے ہوئے ڈبے لاتے ہیں، چھوٹے چھوٹے آئینے لاتے ہیں اور لڑکیاں دیوانی ہو جاتی ہیں اور اپنا منہ رنگ کر ان کے پیچھے دوڑتی ہیں، سپاہی دریا میں اور تالابوں میں ننگے نہاتے ہیں اور لڑکیاں کنارے کھڑی ہو کر ان کا تماشا دیکھتی ہیں، میں نے اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھا ہے اور کئی بار سوچا کہ یہ سب لڑکیاں قحط اور وبا میں مر کیوں نہیں گئیں، مچھلیاں پکڑنا، کھیت بونا اچھا پیشہ ہے، مانا کہ اس میں غریبی دور نہیں ہوتی، لیکن عزت تو باقی رہتی ہے، گھر بار تو رہتا ہے، لیکن یہ منہ پر رنگ پوت کے دیسی بدیسی سپاہیوں سے آنکھیں لڑانا کہاں کا پیشہ ہے۔ لیکن اب جیسے دیکھو وہ یہ ہی کر رہی ہے۔ سپاہی اپنی موٹروں پر گذرتے ہیں تو سڑک کے کنارے کھڑی ہوتی لڑکیوں کو اپنے ساتھ بٹھا لیتے ہیں اور دو تین میل آگے جا کر چھوڑ دیتے ہیں وہاں سے دوسرے سپاہی انھیں اٹھا لے جاتے ہیں، چٹ گاؤں سے پتنگا اور پتنگا سے رامو اور رامو سے کوکس بازار تک یہی سلسلہ ہے، سب لڑکیاں خراب ہو گئی ہیں کوئی اچھی نہیں رہ گئی، میں سوچتا ہوں ہم پر جاپانی بم کیوں نہیں گرتے۔"

پچھم کے ساحل پر ایک گاؤں آباد تھا، اور اس کے سرسبز درختوں کا جھنڈ چاندنی میں آہستہ آہستہ پیچھے سرک رہا تھا، بوڑھے ماہی گیر نے اپنی انگلی کا اشارہ کر کے کہا،

www.taemeernews.com

"وہ گاؤں دیکھتے ہو، قحط کے زمانے میں وہاں کے تمام آدمی مر گئے، ان کی لاشیں گیدڑوں اور کتوں نے کھائیں، اس سال درختوں میں پھل نہیں آتے، بلکہ شاخوں میں گدھ پھیلے تھے، گدھ ہی گدھ جو اکثر زندہ آدمیوں پر بھی جھپٹ پڑتے تھے، کوئی آدمی اس طرف آنے کی ہمت نہیں کرتا تھا، ایک رات کیا ہوا کہ ٹھیک بارہ بجے کے وقت دو سے گاؤں سے ایک شعلہ بلند ہوا اور اس گاؤں کی طرف چلا تھوڑی دیر میں پچھم کی طرف سے ایک شعلہ اٹھا اور وہ بھی اس گاؤں کی طرف چلا اور پھر دونوں شعلے مل گئے، اس کی خبر چاروں طرف پھیل گئی، اب روز رات کے وقت بارہ بجے آگ کے دو شعلے ناچتے ہوئے چلتے تھے، ایک پورب سے اور دوسرا پچھم سے۔ اور دونوں اس گاؤں میں آکر مل جاتے تھے، کسی نے کہا بھوت ہیں، کسی نے کہا پریت ہیں، اور تم جانتے ہو کہ مرنے کے بعد انسان بھوت پریت بن جاتے ہیں، اور یہاں تو ہزاروں آدمی مرے پڑے تھے، جب میں نے پہلی بار ان بھوتوں کو دیکھا تو میرا دل کانپ اٹھا، میں ڈرپوک آدمی نہیں ہوں۔ لیکن بھوت پریت سے تو سبھی ڈرتے ہیں۔"

بیٹے نے آپ کو ٹوک دیا۔ "یوں نہیں ہوا تھا، میں سناتا ہوں، میں نے تو ان شعلوں کو پکڑا تھا۔"

"سچ؟ تم نے ان شعلوں کو پکڑ لیا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

بوڑھے نے خوش ہو کر کہا۔ "میرا بیٹا بڑا بہادر ہے"۔ اور نوجوان ماہی گیر کا سینہ اور چوڑا ہو گیا اور بازوؤں کی مچھلیاں پھڑک اٹھیں۔

اس نے بہت گمبھیر لہجے میں کہا کہ "کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ ان بھوتوں کو پکڑ لے، ارد گرد کے تمام گاؤں تھر تھر کانپتے تھے کوئی کہتا تھا بھوت ہیں، کوئی کہتا تھا پریت ہیں، کوئی کہتا تھا کہ انگریزوں نے ایسے بم بناتے ہیں جو رات بھر خود بخود پہرہ دیتے رہتے ہیں اور دشمن کو پہچان کر اس پر جھپٹ پڑتے ہیں۔ بات ہی

www.taemeernews.com

ایسی تھی۔ اس سے پہلے چٹ گاؤں کے کسی آدمی نے شعلوں کو چلتے نہیں دیکھا تھا، میرے دل میں کچھ اور ہی آئی، میں نے کہا کہ جان رہے یا جائے، میں ضرور پتہ لگاؤں گا کہ یہ شعلے کیا ہیں۔ کہاں سے آتے ہیں اور کہاں جاتے ہیں۔"

چاند اتنی دیر میں کافی اونچا ہو گیا تھا اور اس کی کرنوں کی پھوار ہولے ہولے جھونکوں کے ساتھ زمین پر گر رہی تھی، رات ٹھنڈی ہو چلی تھی دونوں ماہی گیروں نے ایک چلم اور بھری اور باری باری اس کا کش لے کر میری طرف بڑھا دی۔

"میں کئی دن تک منصوبے باندھتا رہا، لیکن ہمت نہیں پڑتی تھی، آخر ایک دن جی کڑا کر کے میں تیار ہو گیا، میں نے اپنی لنگوٹ کس کر باندھ لی اور ہاتھ میں بلم لے لیا اور رات کے گیارہ ہی بجے سے جا کر اس راستے میں بیٹھ گیا، جہاں سے وہ دونوں شعلے گذرتے تھے، میرا دل میرے سینے سے نکل کر میرے کانوں میں آ گیا تھا، اور اس کی دھڑکن سے کان کے پردے پھٹے جا رہے تھے، میں جس پیڑ کے نیچے بیٹھا تھا، اس کی شاخیں میرے سر پر چڑھتی چلی آ رہی تھیں، اور مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے یہ اب مجھے کچل دیں گی۔ چاروں طرف سناٹا تھا، صرف گھاس میں دبکے ہوئے کیڑے مکوڑوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں، یا کبھی کبھی کتے رونے لگتے تھے، اور گیدڑ بولنے لگتے تھے، یا پیڑوں پر بیٹھے ہوئے گدھ اپنے پر پھڑپھڑاتے تھے، گیارہ بجے سوا گیارہ بجے، ساڑھے گیارہ بجے، پونے بارہ بجے، بس اب بارہ بجنے ہی والے تھے، اور میرے ہاتھ پاؤں سنسنا رہے تھے، اور خون معلوم ہو رہا تھا رگوں کو پھاڑ کر باہر نکل آئے گا۔

"ٹھیک اس وقت جب شہر کے گھنٹے نے بارہ بجائے تو میں نے دیکھا کہ دور میرے سامنے زمین سے ایک شعلہ اٹھا، اور میری طرف چلنے لگا، دیکھتے دیکھتے دوسری طرف سے ایک اور شعلہ اٹھا، اور وہ بھی میری طرف بڑھنے لگا میرے دل کی دھڑکنیں اور تیز ہو گئیں، دونوں شعلے میرے قریب آتے جا رہے تھے اور

www.taemeernews.com

میں آنکھیں پھاڑے ہوتے اپنے سامنے سے آتے ہوئے شعلوں کو دیکھ رہا تھا، رات کے اندھیرے میں اس کی چمک بہت تیز تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ شعلہ زمین پر نہیں چل رہا ہے، بلکہ ہوا میں اڑ رہا ہے، آہستہ آہستہ ہوا میں معلق شعلہ میرے قریب آتا گیا، میرا بدن سن ہو گیا، زبان منہ میں اینٹھ گئی، بلم کو چھوا تو وہ کئی من کا معلوم ہوا، میرے پیر زمین نے پکڑ لئے تھے، اور اب مجھ میں اٹھنے کی بھی سکت نہیں تھی، میں نے عمر میں پہلی بار یہ محسوس کیا کہ میں بزدل ہوں، مگر اب کیا ہوتا، موت میرے سر پر آگئی تھی، اور وہ شعلہ مجھ سے دو تین گز کے فاصلے پر تھا، اور میں اس کے راستے میں بیٹھا ہوا تھا، یکایک میرے سارے جسم میں ایک آگ سی لگ گئی، خون جو رگوں میں جم گیا تھا، پھر تیزی سے دوڑنے لگا اور کسی نے مجھے زمین سے اوپر اچھال دیا، اور میرے منہ سے بے ساختہ نکلا، کون ہے؟"

نوجوان ماہی گیر چپ ہو گیا، اور بوڑھا ماہی گیر اپنی پھٹی ہوئی قمیص پر ایک پھٹی صدری پہننے لگا، رات کی خنکی بڑھ رہی تھی، ہم شاید سمندر کے قریب پہونچ رہے تھے، کیونکہ بوڑھا ماہی گیر کشتی میں لپٹے ہوئے چپوؤں کو ادھر ادھر لگا رہا تھا ہوا کے جھونکے بھی بھیگے ہوئے تھے اور ان میں ہلکے سے نمک کا ذائقہ تھا۔

میں نے حیرت، استعجاب اور شوق سے پوچھا" پھر کیا ہوا؟"

نوجوان ماہی گیر نے اپنی چلم سے دو تین لمبے لمبے کش اور لیتے، اور پھر دریا میں چلم الٹ دی۔

"ہاں تو میرے منہ سے بے ساختہ نکلا کون ہے۔ اسی کے ساتھ فضا میں ایک چیخ بلند ہوئی اور زمین پر بہت سارے انگارے بکھر گئے، میرے سامنے ایک ننگ دھڑنگ عورت کھڑی ہوئی تھی، جس کا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔

"عورت"؟ میں نے پوچھا، جیسے مجھے یقین نہ آیا ہو۔

www.taemeernews.com

"ہاں عورت.... جوان عورت ایسی ہی کوئی بیس برس کی اور سر سے پاؤں تک ننگی، میں نے لپک کر اسے پکڑ لیا۔ اس نے اپنے آپ کو چھڑانے کی بالکل کوشش نہیں کی، بلکہ میرے کندھے پر سر رکھ کر ہچکیاں لینے لگی، اور میرا سینہ اس کے آنسوؤں سے بھیگ گیا۔ کوئی دس گز کے فاصلے پر انگاروں کا ایک ڈھیر اور پڑا ہوا تھا اور اندھیرے میں ایک پرچھائیں سی بھاگتی ہوئی نظر آرہی تھی، میں نے پوچھا "تو کون ہے"۔ لیکن ہچکیوں اور سسکیوں کے سوا کوئی جواب نہیں ملا، میں نے پھر پوچھا، تو کون ہے۔ تو کون ہے۔ لیکن وہ مسلسل روئے جارہی تھی، آخر میں نے اس کا سر اپنے کندھے سے اٹھایا اور اسے غور سے دیکھا۔ ارے یہ تو چہرو تھی۔ عبداللہ چاچا کی بیٹی۔ میں نے کہا چہرو تجھے کیا ہوگیا ہے، یہ رو کیوں رہی ہے، منہ سے بولتی کیوں نہیں، میں بھلا تیرا کچھ بگاڑوں گا، میں گنیش ہوں، گنیش مچھیرا۔

"ہاں" اس نے سسکی لیتے ہوئے کہا۔

"مجھے بڑی شرم آرہی تھی، کہ ایک ننگی عورت میری گود میں ہے، میں نے بہت کوشش کی لیکن آنکھیں بند نہیں کر سکا، ستاروں کی روشنی میں میں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا، وہ بے حد خوبصورت تھی، جیسے کوئی اپسرا۔

وہ اپنے گاؤں کی سب سے خوبصورت لڑکی تھی، عمر بیس برس کی ہوگئی تھی۔ لیکن اب تک بیاہ نہیں ہوا تھا، اس کے باپ کے پاس بیاہ کرنے کے لئے روپیہ تھا ہی نہیں۔ گاؤں کے تمام لڑکوں کی رال اس پر ٹپکتی تھی، اور وہ جس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ لیتی تھی، یا ذرا سا مسکرا دیتی تھی اس کا دل کئی دن تک دھڑکتا رہتا تھا، میں نے بھی اسے کئی بار دیکھا تھا اور دل میں یہ سوچا تھا، کاش وہ مچھیری ہوتی یا میں مسلمان ہوتا، میں اس سے ضرور شادی کر لیتا، لیکن مشکل یہ تھی کہ میں مچھیرا تھا اور وہ مسلمان۔ لیکن آج رات کو بارہ بجے گاؤں کی یہ سب سے خوبصورت لڑکی جس پر ہر جوان لڑکا اپنی جان چھڑکتا تھا، اکیلی اور ننگی میری گود میں تھی چاروں

www.taemeernews.com

طرف سے سڑی ہوئی لاشوں کی بو آرہی تھی درختوں پر گدھ اپنے پروں کو پھڑپھڑا رہے تھے، کتے رو رہے تھے، اور گیدڑ بول رہے تھے اور چھرو میرے سینے پر سر رکھے ہوئے رو رہی تھی۔

"میں چھرو کو لے کر کھیت کی مینڈ پر بیٹھ گیا، میں نے سوچا اسے جی بھر کے رو لینے دو جب اس کے دل کے سارے آنسو بہہ جائیں گے تب بات کروں گا۔"

بوڑھے ماہی گیر نے آواز دی۔ "سمندر آگیا، چپو سنبھالو" گنیش پیچھے اور اس کا باپ آگے بیٹھ گیا، اور چپو چپاچپ چلنے لگا، میں ابھی اٹھ کر بیٹھ گیا، دریا کی انفرادیت غائب ہو چکی تھی اور اب ہمارے چاروں طرف پانی ہی پانی تھا، سمندر پر ایک غنودگی طاری تھا، لہریں آہستہ آہستہ سانس لے رہی تھیں ہوا کے جھونکے بڑے ہلکے تھے، ہماری کشتی پورب کی طرف مڑ گئی تھی اور چاند ہمارے سر پر چمک رہا تھا، ایک خوبصورت چہرے کی طرح جو مکان کی سب سے اونچی منزل کی کھڑکی سے جھانک رہا ہو اور راہ گیروں پر اپنے حسن کی بارش کر رہا ہو، دونوں ماہی گیر بڑی پھرتی اور صفائی سے چپو چلا رہے تھے، ان کے جسم ایک ساتھ آگے جھکتے تھے اور پھر سیدھے ہو جاتے تھے، سیدھے ہوتے وقت ان کے کندھے بلند ہوتے تھے، اور سینے تن جاتے تھے، چپو بھی ان کے ہاتھ معلوم ہوتے تھے، جو سمندر تک پھیلے ہوئے تھے، اور موجوں کو اس طرح کاٹ رہے تھے، جیسے ہنسیا دھان کے پکے کھیتوں کو کاٹتا ہے، ان کے بازوؤں کی جنبش میں ایک خاموش ہم آہنگی، اور ترنم تھا جو سمندر کی موجوں کے ترنم سے مل گیا تھا۔

وہ دونوں بڑی دیر تک کشتی کھیتے رہے، یہاں تک کہ چاند پچھم کی طرف ڈھل گیا، اور ایک گول ٹکیا سمندر کی سطح کے قریب لرزنے لگی، باپ اور بیٹا دونوں تھک کر چور ہو گئے اور سستانے کے لئے انھوں نے پھر چپو نکال کر کشتی میں لٹا دیئے۔ گنیش نے اپنی ہتھیلیاں ملیں، بوڑھے ماہی گیر نے پھر حلیم بھری،

www.taemeernews.com

اور کشتی کی ایک دیوار سے سہارا لے کر لیٹ گیا، بادبان میں بھری ہوئی ہوا کشتی کو آہستہ آہستہ چلا رہی تھی۔

میں نے گنیش کو آواز دی، وہ مسکرانے لگا "تم چہرو کے بارے میں سوچ رہے ہو گے۔"

"ہاں!"

میرے دل میں بھی چہرو ہی بیٹھی ہوتی ہے، اس کا نام گل چہر تھا، اور وہ ایک بہت غریب کسان کی لڑکی تھی، سب لوگ اسے چہرو کہتے تھے، قحط میں اس کے ماں، باپ، بھائی، بہن سب مر گئے، وہ اکیلی رہ گئی، اس زمانے میں تو بھیک بھی نہیں ملتی تھی۔ فاقے کرنے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جانے کے سوا چارہ ہی کیا تھا، لیکن چہرو خوب صورت تھی اور اس کی ایک سپاہی سے آشنائی ہو گئی۔ کوئی پنجابی سپاہی تھا وہ اور وہ دونوں چھپ چھپ کر ملنے لگے، ملنے کی یہ انوکھی ترکیب نکالی کہ رات کے بارہ بجے دونوں ننگے ہو جاتے تھے اور اپنے سروں پر آگ کی تھالی بھر کر رکھ لیتے تھے اور اس گاؤں میں چلے جاتے تھے، جہاں کسانوں کی لاشیں سڑ رہی تھیں۔"

"لیکن وہ اس طرح کیوں ملتے تھے؟"

"میں نے بھی چہرو سے یہی سوال کیا کہ تو نے یہ کیا تماشا کیا ہے، رات کے بارہ بجے ننگی ہو کر چڑیلوں کی طرح کیوں نکلتی ہے، اس نے جواب دیا تاکہ لوگ سچ مچ مجھے چڑیل اور میرے سپاہی کو بھوت سمجھیں! میں نے کہا کہ تو اس کے ساتھ نکاح کیوں نہیں کر لیتی تو اس نے بتایا کہ وہ ایک بار اپنے سپاہی کے ساتھ کیمپ میں گئی تھی، تو فوجی افسروں نے اسے دیکھ لیا اور سپاہی کو سزا دی، پھر فوجی ٹھیکیداروں نے اس کے پاس آدمی بھیجے کہ چل تجھے بڑے افسروں کے پاس لے چلیں گے لیکن وہ بڑے افسروں کے پاس نہیں جانا چاہتی تھی، وہ کوئی بیسوا تھوڑی تھی، اسے سچ مچ اپنے سپاہی سے محبت تھی، اس لئے رات کے بارہ بجے جب تمام گاؤں کے لوگ ڈر کے

www.taemeernews.com

مارے گھروں میں چھپ جانے تھے، تو وہ اپنے سر پر آگ سے بھری ہوئی تھالی رکھ کر نکلتی تھی، اور اپنے سپاہی سے مل کر واپس چلی جاتی تھی، سپاہی اس کو کھانے اور رہنے کا خرچ دیتا تھا، جب میں نے اس کا پورا قصہ سنا تو مجھے بڑا افسوس ہوا میں نے اس سے معافی مانگی، لیکن اس نے کہا کہ "اب میں اپنے سپاہی سے نفرت کرنے لگی ہوں" میں نے پوچھا کیوں تو بولی کہ "وہ مجھے اکیلا چھوڑ کر بھاگ گیا۔ ڈرپوک کہیں کا۔ وہ تو کہو کہ تم تھے، اور تم مجھے جانتے ہو کوئی اور ہوتا تو کیا ہوتا۔ اور تم نے بھی مجھے ننگا دیکھا ہے، بتاؤ تمہیں میرا جسم دیکھنے کا کیا حق ہے۔ میں تمہاری بیوی نہیں ہوں، تمہاری معشوقہ نہیں ہوں۔ تم نے میرے جسم پر اپنی نگاہیں کیسے ڈالیں"۔ یہ کہہ کر چہرو مجھ سے لڑنے لگی، وہ تن کر کھڑی ہو گئی، اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے، اور اس نے اپنے خوب صورت بالوں سے اپنا سینہ چھپا لیا تھا۔ میں نے کہا چلو میں تم کو گھر پہونچا آؤں، لیکن اس نے انکار کر دیا۔ کیا سمجھتے ہو۔ میں ڈرتی ہوں۔ میں خود چلی جاؤں گی۔ جہاں میرا جی چاہے گا وہاں جاؤں گی۔ میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ وہ دیر تک کھڑی ہوئی سانس لیتی رہی۔ اور پھر خود ہی بڑی نرمی سے بولی۔ تم کسی سے کہو گے تو نہیں۔ میں نے وعدہ کیا تو وہ مسکرائی۔ اس سے میری ہمت بڑھی۔ اور میں نے کہا۔ چہرو میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ مجھ سے بیاہ کرو گی۔ وہ بہت زور سے ہنسی قہقہہ مار کر جس کی آواز سن کر کتے پھر رونے لگے۔ اور گدھا اپنے پر پھڑپھڑانے لگے۔ میں نے کہا چہرو میں سچ مچ تم سے بیاہ کرنا چاہتا ہوں۔ آج سے نہیں، بلکہ دو برس سے میں تمہارا دیوانہ ہوں۔

چہرو پھر سنجیدہ ہو گئی اور کہنے لگی "تم نے پہلے کیوں نہیں بیاہ کی بات کی۔ مجھے دو وقت کھانا دے سکو گے۔ میری بڑی بہن دس برس کی بیاہی تھی، لیکن اس کے میاں نے اسے ہاتھ پکڑ کر باہر نکال دیا۔ میری ماں نے مرنے سے پہلے اپنے تین برس کے بیٹے کو گھر سے ڈھکیل دیا۔ ایک مٹھی بھر چاول کے لئے میرا باپ گلہ گھونٹنا چاہتا تھا،

www.taemeernews.com

بتاؤ تم مجھ سے بیاہ کر کے مچھلی اور بھات کہاں سے دوگے، آج تم نے مجھے ننگا دیکھا ہے تو تمہیں مجھ سے محبت ہو گئی، لیکن اس محبت سے تم چاول نہیں خرید سکو گے، چاول، چاول۔ دو روپیہ سیر بک رہا ہے۔ دو روپیہ سیر"۔ یہ کہتی ہوئی وہ چلی گئی، چہرو چلی گئی۔ اور اس کا خوب صورت جسم اندھیرے میں کھو گیا۔ میرے سامنے زمین پر انگاروں کا ڈھیر پڑا تھا جو رفتہ رفتہ بجھتے جا رہے تھے۔ وہ راتوں رات کہیں نکل گئی، اور آج تک واپس نہیں آئی، اس قصے کو چھ مہینے ہو گئے ہیں۔ میں اپنے دل میں چہرو کی یاد لیئے بیٹھا ہوں، جب بہت اداس ہوتا ہوں تو کشتی لے کر دریا میں نکل جاتا ہوں، جسمانی محنت سے دل کا درد دور ہو جاتا ہے"۔

گنیش تھوڑی دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا اور پھر خاموشی سے اٹھ کر چپو چلانے لگا، اس کا بوڑھا باپ خراٹے لے رہا تھا، اور سمندر کی موجیں سسک رہی تھیں۔

میں بھی لیٹے لیٹے سو گیا، گنیش رات بھر اکیلا چپو چلاتا رہا، جب صبح میری آنکھ کھلی تو سورج نکل رہا، سمندر کی موجیں ناچ ناچ کر گیت گا رہی تھیں۔ ہمارے پیچھے سبز رنگ کا زمرد یں سمندر تھا اور سامنے سنہرے رنگ کا سمندر جس کے کنارے کوکس بازار کا دلکش ساحل پھیلا ہوا تھا۔ سپاری کے نازک درخت سر اٹھائے کھڑے تھے، جیسے ابھی سمندر سے نہا کر نکلے ہوں، اور دھوپ میں اپنے بال سکھا رہے ہوں، دونوں ماہی گیر تیز تیز چپو چلا رہے تھے، اور کشتی کوکس بازار کے ننھے سے دریا کے دہانے میں داخل ہو رہی تھی۔

اب ہم پتلے سے دریا کے اندر تھے، اور ہمارے دونوں طرف کالے رنگ کی کیچڑ اور پھر سنہرے رنگ کا ساحل تھا۔ ایک طرف ہزاروں فوجی موٹریں اور توپیں کھڑی تھیں۔ دوسری طرف ہوائی اڈے پر سیکڑوں جہاز بڑی بڑی ٹڈیوں کی طرح اپنے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ کئی جہاز سر پر منڈلا رہے تھے، جہاز توڑ توپیں اپنے دہانے آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے جاپانی جہازوں کا انتظار کر رہی تھیں اور بہت سے

www.taemeernews.com

سپاہی، افسر اور مزدور ریت پر چل پھر رہے تھے، بیچ دریا میں لکڑی کا ایک پل بنا ہوا تھا، جس کے پاس کئی کشتیاں اور سمپائیں تیر رہی تھیں، ہماری کشتی بھی پل سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

یکایک گنیش کی زبان سے نکلا "چہرو"۔

میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو مبہوت رہ گیا، پل پر ایک دبلی پتلی لڑکی کھڑی تھی، اس نے زرد مخمل کی پتلون اور سبز مخمل کی جیکٹ پہن رکھی تھی، اس کے کٹے ہوئے بال سمندر سے آنے والی ہوا میں اڑ رہے تھے، بھویں تنی ہوئی تھیں اور آنکھوں میں سورج کی کرنوں کی سی تیزی تھی، میں نے پھر نظر بھر کر اس کی طرف دیکھا اس کے رخسارے پاؤڈر اور رنگ سے گلابی ہو رہے تھے، اور ہونٹوں پر لپ اسٹک کی ایک بڑی گہری تہہ جمی ہوئی تھی، باتیں ہاتھ کی کلائی پر گھڑی بندھی تھی، اور داہنے ہاتھ میں ایک فوجی بید تھا۔

اس نے بید سے میری طرف اشارہ کر کے کہا "بھدر لوگ" اور اس کی آنکھوں میں ایک وحشی چمک ناچ اٹھی۔

بوڑھے ملاح نے جلدی سے کہا "پرمٹ دکھاؤ"۔

میں نے جیب سے پرمٹ نکالا اور کشتی میں کھڑے ہو کر چہرو کی طرف بڑھا دیا، لیکن اس نے پرمٹ کی طرف دیکھا بھی نہیں اور مجھ سے کہا "کشتی سے نیچے اترو"

میں نے پل پر چڑھنے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس نے اپنے بید سے ایک ٹھوکا دے کر کہا "اوپر مت چڑھو، کشتی سے نیچے اترو"۔

لیکن نیچے سیاہ رنگ کی کیچڑ تھی، میں حیران تھا اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔

گنیش نے کہا "چہرو تو کتنی بدل گئی ہے، دیکھتی نہیں نیچے کیچڑ ہے"۔

"دیکھ رہی ہوں" چہرو نے گنیش کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔

www.taemeernews.com

"اسی لئے تو کہہ رہی ہوں کہ اسے نیچے اتارو۔ یہ "بھدّر لوک"[1] ہے اور بھدر لوک کو پل پر چڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔ اسے کیچڑ میں چلاؤ تاکہ اس کے سفید کپڑے لت پت ہو جائیں، جلدی کرو، دوسری کشتیاں آ رہی ہیں"۔

چہرو کی آواز میں ایک قسم کا وقار تھا، آنکھوں میں وہی وحشی چمک۔ گنیش اور بوڑھے ملاح کے چہروں پر پریشانی تھی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا کئی فوجی کشتیاں آ رہی تھیں۔

میں کیچڑ میں چلنے کو تیار ہو گیا، اور اپنے جوتے اتارنے لگا، گنیش نے اپنے مضبوط بازوؤں کی جنبش سے میرا سامان اٹھا کر ساحل پر پھینک دیا، بوڑھے ملاح نے کہا۔ "چہرو تو بڑی افسر ہو گئی ہے، اور سب کو بھول گئی ہے"، پھر میری طرف اشارہ کر کے بولا "یہ بھدر لوک نہیں ہیں۔ بمبئی سے آتے ہیں، غریبوں کی سیوا کرتے ہیں"۔

آخری جملہ سن کر چہرو کو گھن آ گئی۔ اس کے ہونٹ تلخی سے اینٹھ گئے اور اس نے اپنی وحشی آنکھوں سے مجھے گھور کر دیکھا پھر بولی "سب بھدر لوک ایک سے ہوتے ہیں، اور غریبوں کی سیوا کرتے ہیں۔ چاچا میں تمہیں بھولی نہیں ہوں، اپنی ماں کی کوکھ کو بھی نہیں بھولی ہوں، مجھے خوب یاد ہے کہ میں کون ہوں، تم مچھیرے ہو اور میں کسان کی لڑکی ہوں، میں بھدر لوک کو اس کیچڑ میں چلاتی ہوں تم نے اسے سمندر میں ڈبو کیوں نہیں دیا۔ بھدر لوک کہیں کا"۔

میں اتنی دیر میں کیچڑ میں اتر چکا تھا، اور جیب سے روپئے نکال کر کشتی کا کرایہ ادا کر رہا تھا میرے پیر گھٹنوں گھٹنوں تک سیاہ کیچڑ میں دھنس گئے تھے پل پر کھڑی ہوئی چہرو مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھی اور گنیش اسے للچاتی ہوئی نظروں

---

[1] بنگالی زبان میں درمیانی طبقے کے سفید پوش آدمی کو بھدر لوک کہتے ہیں۔

www.taemeernews.com

سے دیکھ رہا تھا۔

جب میں کیچڑ سے گذر کر ساحل پر پہونچا تو چہرو کا قہقہہ بلند ہوا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر گنیش کو پل کے اوپر چڑھا لیا اور اس سے ہنس ہنس کر آہستہ آہستہ کچھ باتیں کرنے لگی۔

گنیش نے پکار کر باپ سے کہا، "بابا تم جاؤ میں یہیں رہوں گا۔"

بوڑھے ملاح نے ملامت بھری نظروں سے دونوں کو دیکھا اور بولا "پاگل بن بیٹا۔ چہرو تیرے کام کی نہیں رہ گئی ہے۔"

چہرو نے مسکرا کر گنیش کے رخسار پر اپنی ہتھیلی سے ایک ہلکی سی تھپکی دی اور اسے سہارا دے کر پل سے نیچے کشتی میں اتارنے لگی، گنیش نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا، اور کود کر کشتی میں بیٹھ گیا، اس نے دونوں ہاتھوں میں چپو اٹھا لئے اور انھیں تیز تیز چلاتا ہوا کشتی کو نکال لے گیا۔ چہرو کی نگاہیں دور تک اس کا تعاقب کرتی رہیں۔

میں ایک میلے تولیے سے اپنے پیروں کی کیچڑ پونچھ رہا تھا کہ چہرو پل سے اتر کر میرے پاس آ کھڑی ہوئی اور پوچھنے لگی "تم کہاں سے آئے ہو؟ بمبئی سے؟"

"جہنم سے" میں نے جل کر جواب دیا۔

"میں کبھی بھدرلوک کو پیٹ بھی دیتی ہوں، اپنے بید سے" چہرو کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

میں نے گردن اٹھا کر اس عجیب و غریب لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی وحشی چمک میں بلا کا جادو تھا، اور پیشانی پر نفرت اور شرارت سے پڑی ہوئی ہلکی ہلکی شکنیں، اس کے خوب صورت بیضاوی چہرے کی معصومیت میں وقار کا اضافہ کر رہی تھیں۔ میں اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا، گنیش کی کہانی نے میرا شوق اور بڑھا دیا تھا، لیکن چہرو کے تیور بڑے خطرناک تھے، اور مجھے زبان کھولنے کی اجازت ہی نہیں دیتے تھے۔

www.taemeernews.com

"مجھے گالی کیوں دیتی ہو۔ میں بھدرلوک نہیں ہوں"۔ میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"اچھا تم بھدرلوک کو گالی سمجھتے ہو؟" وہ ہنسی "مگر تمہارے کپڑے تو ویسے ہی ہیں"۔

"اور تمہارے کپڑے"

"یہ تو میں نے بھدرلوکوں کو جلانے کے لئے پہنے ہیں۔ مجھے اچھے تھوڑی لگتے ہیں"۔

"اور یہ چہرے پر رنگ جو تم نے پوت رکھا ہے"؟

"روزی کمانے کے لئے"۔

میں اس کی صورت دیکھتا رہ گیا، بے حیائی تھی بے باکی تھی، یا انتقام کا جذبہ۔ میں کچھ فیصلہ نہ کر سکا۔

"اچھا تو تم بھدرلوک نہیں ہو اور غریبوں کی سیوا کرتے ہو؟" اس نے بڑے طنز سے پوچھا۔ "کالا بازار کرتے ہو یا لڑکیاں بیچتے ہو؟" اس کے ماتھے کی شکنیں اور گہری ہوگئیں، اور تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ ہونٹوں پر ایک تلخ سی ہنسی آئی اور وہ مجھے نفرت اور حقارت سے دیکھتی ہوئی چلی گئی، اور میں سوچتا رہ گیا کہ یہ کیسی لڑکی ہے جس میں کسانوں کی بو باس تک باقی نہیں رہ گئی ہے۔

یہ بغاوت اور انتقام نہیں ہے، صرف نراج اور آوارگی ہے۔ یہ پارے سے بنی ہوئی لڑکی جس کی رگوں میں بجلیاں بھری ہوئی ہیں، خود اپنی ذات سے انتقام لے رہی ہے، اپنی فطرت اور اپنی نسوانیت سے بغاوت کر رہی ہے۔ جیسے سمندر کی کوئی بے تاب موج طوفان کی آغوش سے نکل کر ساحل پر آپڑی ہو اور اپنے تھپیڑے سے خشک ریت کو سمندر بنانے کی کوشش کر رہی ہو۔ ننھے ننھے خاک کے ذرے اسے اپنا رزق سمجھ کر ایک ایک گھونٹ کر کے پی جائیں گے۔

کوکس بازار میں ہر ایک کی زبان پر چہرو مانجھی کا نام تھا، چہرو چوبیس برس

www.taemeernews.com

کی کسان لڑکی تھی۔ جس نے مزدوری کرتے کرتے مزدوروں کی سرداری حاصل کرلی تھی،.... اور اب مانجھی کہلاتی تھی .... جس نے تھانبی[1] اور بازو اور گمچھا ترک کر کے انگریزی لباس پہننا شروع کر دیا تھا۔ جو اپنے حسن کی وجہ سے فوجی افسروں کے منہ چڑھی ہوئی تھی، جو کسی سفید پوش آدمی کو برداشت نہیں کر سکتی تھی جو ہر ایک کی بے عزّتی کر دیتی تھی۔ جو درجنوں شریف آدمیوں کو کیچڑ میں چلا چکی تھی۔ عورتیں خاص طور سے اس سے نفرت کرتی تھیں، لیکن مرد کچھ للچاتے ہوئے لہجے میں اس کی مذمت کرتے تھے۔

دوسرے دن میں نے اسے جیپ میں گذرتے دیکھا۔ اس کی گود میں پھولوں کا ایک بڑا سا گچھا رکھا تھا۔

تیسرے دن وہ مجھے ایک چرنگ[2] کے پاس کھڑی ہوئی مل گئی اور مجھے دیکھ کر مسکرا دی۔

میں نے کہا۔ "کیسی ہو چہرو"۔

"کیسی ہوں"؟ اس کی آنکھیں پھر چمک اٹھیں۔ "اچھا یہ بتاؤ۔ میں پتلون اور جیکٹ پہن کر کیسی لگتی ہوں"۔

"بالکل انگلستان کی شہزادی معلوم ہوتی ہو"۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اس کے دونوں رخساروں میں دو چھوٹے چھوٹے گڑھے پڑ گئے، اور خوب صورت سفید دانتوں کی قطار چمکنے لگی۔ اتنے میں ایک فوجی

---

[1] تھانبی رنگین دھوتی کو کہتے ہیں، جو چٹ گاؤں کی مسلمان عورتیں باندھتی ہیں۔ بازو، چولی یا انگیا کو کہتے ہیں اور گمچھا دوپٹے کو۔ [2] چرنگ لکڑی کا بنا ہوا ایک طرح کا جھونپڑ جو پبلک کے استعمال کے لئے سڑکوں کے کنارے بنا دیا جاتا ہے، لوگ اس میں بیٹھ کر سستاتے بھی ہیں اور بے گھر لوگ اکثر رات کو اس میں سوتے بھی ہیں۔

www.taemeernews.com

ٹرک آئی۔ چہرو نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ اور اچک کر اس میں بیٹھ گئی، جب ٹرک چلی تو وہ کھڑی ہوئی تھی۔ اور اس کے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھے ہوئے تھے اور بال ہوا میں اڑ رہے تھے، گاڑی کے پہیوں سے اڑنے والی سرخ دھول نے جو سپاری کے پیڑوں تک بلند ہو گئی تھی اسے ڈھانپ لیا۔

شام کو سارے کوکس بازار میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ ہر شخص یہ کہہ رہا تھا کہ چہرو کو یہاں سے نکال دو۔ اس نے رامو روڈ پر ٹرک سے اتر کر کسی شریف آدمی کو مارتے مارتے لہولہان کر دیا تھا۔ ساری بستی اس کے خلاف ہو گئی تھی، لیکن فوج کا خوف انھیں زبانی احتجاج سے آگے نہیں بڑھنے دیتا تھا۔

رات کو یہ خبر آئی کہ فوجی افسروں نے اسے سزا دی ہے اور اب وہ ساحل کے علاقے سے باہر بستی میں نہیں نکلنے پائے گی۔ لوگ اطمینان کا سانس لے کر سو گئے اور پھر چہرو کے افسانے مزے لے لے کر بیان کرنے لگے۔

صبح ساحل پر چہرو مزدوروں کی ایک ٹولی کو کچھ ہدایت دے رہی تھی۔ اس وقت سمندر میں پانی چڑھ رہا تھا اور لہریں دوڑ دوڑ کر ساحل کا منہ چوم رہی تھیں۔ بڑی بڑی سو سو گز لمبی لہریں روئی کے گالوں کی طرح بہتی ہوئی اور اپنی چاندی اچھالتی ہوئی آتی تھیں اور ریت پر جھاگ چھوڑ کر چلی جاتی تھیں۔ چہرو ایک نیلے رنگ کا چست لباس پہنے ہوئے تھی اور ابھی ابھی سمندر سے نہا کر نکلی تھی۔ اس کے دونوں بازو، آدھی رانیں اور پنڈلیاں ننگی تھیں، جن پر سمندر کے نمک کا باریک بورادہ جما ہوا تھا۔ بھیگے ہوئے بال الجھے ہوئے تھے اور چہرے کا گندمی رنگ سمندر کے نمکین پانی سے دھل کر نکھر آیا تھا، میں نے پہلی بار اس کے سڈول جسم کی دلکشی کا اندازہ کیا۔

وہ مجھے دیکھ کر ایک بار تن گئی اور اس کا سینہ سمندر کی کسی لہر کی طرح بلند ہو گیا "کیا تم بھی مزدوری چاہتے ہو؟ میں نے کل شام تمہاری ہی طرح کے ایک بھدر لوک کو بیٹا تھا، جو مجھے سڑک کے کنارے کھڑا ہوا گھور رہا تھا۔ کیا تمہاری بھی شامت

www.taemeernews.com

آتی ہے؟"۔

"تمہیں بھدر لوک سے اتنی نفرت کیوں ہے۔؟"

"تم سے مطب؟ تم ہوتے کون ہو؟"۔

"میں کیسے بتاؤں جب تم سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتی ہو؟"

میں حیران رہ گیا اس نے لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور دوڑتی ہوئی بالکل ساحل کے کنارے پہونچ گئی جہاں سمندر کی موجیں ریت کا منہ دھو رہی تھیں۔ وہ بھیگی ہوئی ریت پر بیٹھ گئی۔ اپنے پیر سمندر کی طرف پھیلا دیئے۔ اور کہنیاں نرم مخملیں ریت پر ٹیک دیں۔

"مجھے ایک بات بتاؤ گے؟" اس نے ایسی محبت سے پوچھا جیسے مجھے برسوں سے جانتی ہو۔

"پوچھو!"

"گنیش نے تم سے میرے بارے میں کچھ کہا ہے؟"

"ہاں، وہ تم سے محبت کرتا ہے۔"

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا دوڑ گیا، اور آنکھوں میں بے انتہا نرمی اور لطافت آگئی جیسے کسی نے جادو کے زور سے اس کی وحشت اور خشونت کو بدل دیا ہو اور وہ بے انتہا حسین ہو گئی۔ سمندر کی موجیں اس کے پیروں کو چوم رہی تھیں اور ہوا کی غیر مرئی انگلیاں اس کے بالوں میں کنگھی کر رہی تھیں۔

وہ بڑی دیر تک اپنے دونوں ہاتھوں سے ریت کے گھروندے بناتی رہی اور بگاڑتی رہی۔ "مجھے اس ریت سے بڑی محبت ہے۔ میں اس سے پیدا ہوئی ہوں گنیش بھی اسی سے پیدا ہوا ہے۔ میں اکثر آکر اس ریت کی گود میں لیٹ جاتی ہوں اور گھنٹوں خواب دیکھتی رہتی ہوں۔ بڑے بڑے دھان کے کھیت ہیں۔ دور افق تک پھیلے ہوئے کھیت جن کی سنہری بالیاں لہرا رہی ہیں۔ میں اپنے ہنسیئے سے کھیت کاٹ رہی ہوں اور دھان

www.taemeernews.com

کی بالیاں سمیٹ سمیٹ کر کھلیان لگا رہی ہوں۔ میں کٹے ہوئے کھیتوں کی منڈیروں پر گاتی ہوئی گھوم رہی ہوں۔ زمین گا رہی ہے، آسمان گا رہا ہے، ہوائیں گا رہی ہیں اور دریا کے کنارے ایک چھوٹی سی جھونپڑی ہے جس میں گنیش بیٹھا ہوا ہے، اس کے جال میں بڑی بڑی مچھلیاں تڑپ رہی ہیں جنہیں دیکھ کر چھوٹے چھوٹے بچے تالیاں بجا بجا کر ہنس رہے ہیں اور ناچ رہے ہیں۔"

وہ چپ ہو گئی اور ریت کے گھروندے کو اپنی مٹھی میں اٹھا لیا۔

"میں گنیش سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی تھی، لیکن اس کا باپ موجود تھا، بڈھا کھوسٹ۔ کہتا ہے کہ میں گنیش کے قابل نہیں رہ گئی ہوں اور وہ اپنے باپ کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ بزدل کہیں کا۔ دیکھو نا مجھے چھوڑ کر چلا گیا"، اس نے آخری جملہ بچوں کی طرح کہا۔

"مگر تم خود جوا سے چھوڑ کر چلی آئیں"۔

"محبت کرنے کے لئے ہمت کی ضرورت ہے۔ مجھے بزدل آدمیوں سے بڑی نفرت ہے۔ میں ایسے آدمی پسند کرتی ہوں جو ہنستے ہوئے موت کے منہ میں چلے جائیں، دیکھو سمندر میں طوفان آ رہا ہے، پانی گز دو اچھل رہا ہے۔ اگر میں گنیش سے اس وقت کشتی کھینے کے لئے کہوں تو وہ کبھی تیار نہ ہوگا۔ کنارے کھڑا ہوا جال پھینکے گا، مچھیرا ہے نا مچھیرا۔ مجھے بھی مچھلی کی طرح پکڑنا چاہتا ہے، بتاؤ میں مچھلی تو نہیں ہوں۔ بولو کیا میں مچھلی ہوں؟"

"نہیں"۔

"میں مچھلی نہیں ہوں۔ میں عورت ہوں۔ چہرو ہوں۔ گل چہرے میرا نام۔ مجھے کوئی مچھلی کی طرح نہیں پکڑ سکتا۔

ایک مزدور دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا "چہرو مانجھی، چہرو مانجھی۔ تمہیں صاحب نے بلایا ہے"۔

www.taemeernews.com

"کہہ دو نہیں آتی۔"

"وہ بوتھی ڈانگ جا رہے ہیں۔ موٹر میں بیٹھے ہیں۔"

"بس کہہ دو نہیں آتی۔ میں بوتھی ڈانگ نہیں جاؤں گی۔ میں سمندر میں جا رہی ہوں۔"

مزدور چلا گیا۔ میں نے پوچھا "کس نے بلایا ہے"؟

"کوئی نہیں وہ دلال سنہ کا بندر ہے۔ اس کا تبادلہ ہو گیا ہے اور مجھے بوتھی ڈانگ لے جانا چاہتا ہے۔ میں نہیں جاتی۔ اس کے ایسے ہزاروں یہاں ملیں گے۔ کوئی میں ڈرتی تھوڑی ہوں۔ کسی چیز سے نہیں ڈرتی۔ آؤ طوفان میں کشتی چلائیں ..... بڑا مزہ آئے گا۔"

میں کہنا چاہتا تھا کہ کشتی لٹ جائے گی۔ لیکن اس ڈر سے چپ رہا کہ وہ مجھے بزدل سمجھے گی۔

اس نے ایک نازک سی سمپان کا انتخاب کیا اور پل پر چڑھ کر اس میں کود گئی۔

میں نے پوچھا "میں بھدرلوک ہوں۔ کیا کیچڑ میں چل کر آؤں"؟

"پل سے ہو کر آ جاؤ۔ تم بھدرلوک نہیں ہو۔ جب تم میرے کہنے سے بغیر احتجاج کیے کیچڑ میں چلنے کو تیار ہو گئے۔ تب ہی سمجھ گئی کہ تم بھدرلوک نہیں ہو۔"

اس نے چپو سنبھال لئے اور سمپان کھینے لگی۔ اس کے ہاتھ بڑی مشاقی سے چل رہے تھے۔ جب سمندر کا پانی چڑھ رہا ہو اس وقت کشتی کھینا مذاق نہیں ہے میرا دل کانپ رہا تھا کہ کہیں سمپان الٹ نہ جائے۔ لیکن چہرہ بڑے اطمینان سے چپو چلا رہی تھی۔

"تمہیں چپو چلانا آتا ہے"؟ اس نے پوچھا۔

"ہاں بمبئی میں سمندر میں کشتی کھے چکا ہوں۔"

"اور تیرنا بھی آتا ہے؟"

www.taemeernews.com

"ہاں کچھ یوں ہی سا"

"پھر ڈر کی کوئی بات نہیں"۔ یہ کہہ کر وہ چپوؤں کو اور زیادہ تیز چلانے لگی۔

کھلا ہوا سمندر جوش کھائے پانی کی طرح ابل رہا تھا اور ہماری سمپان غصے میں بپھری ہوئی موجوں پر ایک سوکھے ہوئے پتے کی طرح لرز رہی تھی۔ موجوں کے تھپیڑے بڑے سخت تھے۔ اور سمپان بری طرح ڈگمگانے لگی تھی۔ ایک موج کشتی کے اوپر سے گذر کر ہمیں بھگو گئی۔

میں نے کہا۔ "چپو مجھے دے دو"۔

"تم مجھ سے اچھے چپو نہیں چلا سکتے"۔

"سمپان واپس لے چلو۔ الٹ جائے گی"۔

"تم ڈر رہے ہو"۔

میں نے لپک کر چپو پکڑ لئے۔ چہرو نے انھیں میرے ہاتھوں سے چھڑانے کی کوشش کی۔ ایک بار سمپان پھرکی کی طرح ناچ اٹھی اور ایک بڑی سی غضبناک موج نے آکر اسے دس بارہ فٹ اوپر اٹھا لیا اور ایک زبردست جھٹکے سے ساحل پر پھینک دیا۔ ایک دوسری موج ہمارے اوپر سے گذر گئی۔ اور سمندر غرانے لگا، مجھے نہیں معلوم کہ چہرو کہاں گری اور میں کہاں گرا۔ جب موج سر سے گذر چکی تو میں ریت پر پڑا ہوا تھا، اور چہرو مجھ سے کئی گز دور کھڑی ہوئی تھی۔ اور کشتی موجوں کے تھپیڑوں میں تھی ایک چپو ریت میں دھنس گیا تھا اور دوسرا آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے ہوئے فریاد کر رہا تھا۔

اس نے پکار کر پوچھا۔ "چوٹ تو نہیں لگی"۔

"نہیں ریت بہت نرم ہے"۔ میں نے جواب دیا حالانکہ میرے گھٹنے اور کہنیاں چھل گئی تھیں۔

چہرو پھر میرے پاس آکر بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔ "میرا جی چاہتا ہے کہ کوئی اس

www.taemeernews.com

دنیا کو اسی طرح اٹھا کر پھینک دے۔ جب سمندر میں طوفان آتا ہے تو میں خوشی سے دیوانی ہو جاتی ہوں۔ اور میں سوچتی ہوں یہ طوفان بڑھتا جائے گا یہاں تک کہ آسمان اور زمین کے بیچ میں صرف سمندر ہی سمندر ہو گا۔ اس کی نیلی موجوں میں ہم تم گنیش، چاند، سورج، ستارے سب ڈوب جائیں گے۔"

میں نے کہا تم پگلی ہو چہرو۔"

"ہاں میں سچ مچ پگلی ہوں۔ تم بھی پگلے ہو جو میرے پاس بیٹھے ہو۔ گنیش بھی پگلا ہے، جو مجھ سے محبت کرتا ہے۔ اور وہ لاکھوں کسان اور مچھیرے سب پگلے تھے، جو چار دانہ چاول کے لئے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئے۔ صرف بھدر لوک پگلا نہیں ہے۔ باقی سب پگلے ہیں۔"

"تمہیں بھدر لوک سے اتنی نفرت کیوں ہے"۔ میں نے موقع پا کر پھر پوچھا۔

چہرو ایک دم سنجیدہ ہو گئی اور اس کی نظروں کی وحشی چمک اس کی آنکھوں میں واپس آ گئی۔

"جانتے ہو میں کیا کرتی ہوں؟" اس نے مجھ سے پوچھا "میں اپنا جسم بیچتی ہوں اجنبی آدمی تم پہلے شخص ہو، جس سے میں اس طرح باتیں کر رہی ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں بہت خوب صورت ہوں۔ مجھے بھی اپنی صورت اور اپنا جسم بہت اچھا لگتا ہے اور میں اسے بیچتی ہوں۔ ایک رات کے تیس روپے لیتی ہوں اور فوجی افسر مجھے اس سے زیادہ روپے دیتے ہیں۔ تم سمجھتے ہو گے کہ یہ میرا خاندانی پیشہ ہے۔ نہیں۔ میں تو کسان کی بیٹی ہوں، دھرتی کی طرح پاک۔ میں نے یہ پیشہ کبھی نہیں کیا تھا۔ لیکن جب میرے ماں باپ مر گئے، اور سارا گاؤں اجڑ گیا، اور میں ہزاروں لاشوں کے بیچ میں اکیلی رہ گئی اور لاشوں کو نوچ نوچ کر کھانے والے کتے مجھے دیکھ کر اپنے دانت پیستے تھے تو گیارہ دن کے فاقوں کے بعد میں لڑکھڑاتی ہوئی اپنے گاؤں کے زمیندار کے پاس گئی، مٹھی **بھر چاول کی بھیک** مانگنے کے لئے۔ وہ چاول جس کا دھان میں نے پچھلی

www.taemeernews.com

فصل میں اپنے ہاتھوں سے کاٹا تھا. زمیندار کے گھر میں منوں چاول بھرا ہوا تھا. لاشوں کی طرح بوریاں گنجی ہوتی تھیں. وہ اس کا بیوپار کرتا تھا، کالے بازار کا بیوپار۔ جہاں وہ ہمارے کھیتوں کا پیدا کیا ہوا چاول ساٹھ روپے من بیچ رہا تھا. میں گیارہ دن کی بھوکی تھی اور دنیا میں کوئی سہارا نہیں تھا کئی بار میں نے سڑی ہوئی لاشوں کا گوشت کھانے کا ارادہ کیا تھا لیکن گھن آگئی. میں نے زمیندار سے مٹھی بھر چاول مانگے. اس نے پوچھا کیا قیمت دو گی. مگر میرے پاس کیا تھا. میں نے کہا خیرات دیدو اس نے کہا میں کئی خیراتی اسکول اور یتیم خانے چلا رہا ہوں. چٹ گاؤں میں میرا خیراتی لنگر خانہ چل رہا ہے. آخر کہاں تک خیرات دو. میں نے پوچھا پھر میں کیا کروں، چٹ گاؤں تک جانے کی سکت نہیں ہے. میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے' اس نے کہا تمہارے پاس جوانی ہے، خوب صورت چہرا ہے، بھرا ہوا جسم ہے اسے کہو بھاگ کر بیچ آؤ. لیکن میرا جسم چاول کی بوری تو نہیں تھا جو میں اسے بیچ دیتی. میں وہاں سے بھاگ آئی. لیکن دو دن کے بعد جب میں تیرہ دن کی بھوکی تھی، میں اپنا جسم لاش کی طرح گھسیٹ کر زمیندار کے پاس لے گئی. میں نے کہا میں اپنا جسم مٹھی بھر چاول میں بیچنے آئی ہوں. اسے خریدو گے، وہ خفا ہو گیا. بھدر لوک بڑے عزت والے ہوتے ہیں. اس نے کہا میں کوئی دلال ہوں. میں نے کہا میں اپنا جسم کہاں بیچنے جاؤں مجھ سے تو چلا بھی نہیں جاتا، زمیندار نے اپنے گھر سے نکال دیا. اس کا بیٹا جو مجھے گھسیٹ کر باہر لایا تھا. سیر بھر چاول میں میرا جسم خرید لے گیا. تب سے میں محسوس کرتی ہوں کہ میرے پاس میرا جسم نہیں ہے. میری جوانی نہیں ہے. میری خوبصورتی نہیں ہے. یہ سب تو سیر بھر کچے چاول میں بک چکی ہیں. اس کے بعد مجھے ایک سپاہی ملا وہ ڈرپوک تھا. پھر گنیش ملا وہ بھی بزدل نکلا. اور اب کوکس بازار میں میری حکومت ہے. یہاں جتنے آدمی ہیں سب بزدل ہیں. یہاں بہت سے بھدر لوک آتے ہیں. اپنا بیوپار کرنے کے لئے. فوجی ٹھیکہ لینے کے. میں انھیں کیچڑ میں چلاتی

www.taemeernews.com

ہوں۔ کبھی کبھی کسی کو پیٹ بھی دیتی ہوں۔ لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ الٹ کر میرے ایک تھپڑ مار دے۔ انھیں روپے کی ہوس اور لالچ نے بزدل بنا دیا ہے وہ جانتے ہیں کہ میں فوجی افسروں کے منہ چڑھی ہوں۔ اور وہ مجھے تھپڑ مار کر انھیں ناراض نہیں کر سکتے۔ انھیں روپیہ کی ضرورت ہے۔ وہ اپنے گاؤں کی بہو بیٹیاں لاکر فوجی افسروں کے ساتھ بیچ جاتے ہیں۔ تم سمندر کے راستے سے واپس مت جانا۔ ارکان روڈ سے ہو کر جانا۔ چٹ گاؤں یہاں سے اسّی میل دور ہے لیکن یہاں سے چٹ گاؤں تک تین لاکھ کسان عورتیں ہیں۔ جو میری طرح پیشہ کر رہی ہیں۔ اور ان کی کمائی بھدر لوک کھا رہے ہیں۔ تم بھدر لوک نہیں ہو، اس لئے میری بات سمجھ جاؤ گے، وہ کہتے ہیں۔ چہرو مانجھی بدمعاش ہے، چہرو مانجھی آوارہ ہے، چہرو مانجھی بیسوا ہے، لیکن بھدر لوک مجھ سے زیادہ بدمعاش ہیں، مجھ سے زیادہ آوارہ ہیں۔ وہ سب بیسوا ہیں، دلال ہیں۔ ان کی عزت ان کا مذہب، ان کا دیوتا سب کچھ روپیہ ہے۔ اس کے لئے وہ اپنی ماؤں کو بیچ ڈالیں۔ اپنی بیٹیوں کو بیچ ڈالیں۔ ان کی عزت اور شرافت صرف ان کے کپڑوں میں ہے۔ کیا بمبئی میں بھی بھدرک ہوتے ہیں"۔

"بھدر لوک ہر جگہ ہوتے ہیں"۔ میں نے جواب دیا۔

"پھر کچھ نہیں ہو سکتا۔ کچھ نہیں ہو سکتا۔ مجھے ان سے بڑی نفرت ہے"۔ وہ بڑبڑائی۔

سورج کی کرنیں بہت تیز ہو گئی تھیں۔ چہرو مانجھی کے گندمی رنگ چہرے پر پسینے کے موتی چمک رہے تھے۔ سمندر کی موجیں اس کے قدم چوم رہی تھیں اور ہوا کی غیر مرئی انگلیاں اس کے بالوں میں کنگھی کر رہی تھیں، اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور جیسے کوئی غنودگی کے عالم میں باتیں کر رہا ہو، زیر لب آہستہ آہستہ کہا:

"جب یہاں سے جانا تو گنیش سے کہہ دینا کہ میں اس کا انتظار کر رہی ہوں میں

www.taemeernews.com

اس زندگی سے تنگ آگئی ہوں۔"

(انجمن ترقی پسند مصنفین بمبئی کے جلسے میں پڑھا گیا)

بمبئی ۱۹۴۶ء

www.taemeernews.com

خالِ محبُوب اور امنِ عالم

میرے سویت یونین کے سفر کی خوشگوار یادوں کے نگارخانے میں دو نوجوان آرمینی انجینیر بھی ہیں۔ ان کے نام میں نے پوچھے تھے لیکن پھر یاد نہیں رہ گئے، لیکن وہ دل پر جو نقش چھوڑ گئے وہ اب بھی تازہ ہے۔ میرے اور ان کے درمیان حافظ شیرازی کا ایک شعر ہے جس نے ہماری باہمی محبت کے رشتے کو مضبوط کر دیا ہے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اچھی شاعری ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑ دیتی ہے۔ بچھڑے ہوؤں کو ملا دیتی ہے۔ اور اجنبیوں کو دوست بنا دیتی ہے۔

حافظ بیک وقت ایران اور تاجکستان (سویت یونین کی ایک ریاست) کا قومی شاعر ہے اور گذشتہ پانچ چھ سو سال میں اس کی خوب صورت غزلوں نے ساری دنیا کا دل موہ لیا ہے۔ اس کی شاعری اب بھی ہوا کے جھونکوں کی طرح محوِ سفر۔ کبھی اس ملک میں جا نکلتی ہے۔ کبھی اس ملک میں۔ کبھی ایک باغ کو مہکاتی ہے۔ اور کبھی دوسرے باغ میں پھول کھلاتی ہے۔

یہ اتفاق کی بات ہے کہ میں اسٹاک ہوم (سویڈن) میں بین الاقوامی امن کونسل کے کلچرل کمیشن میں حافظ کی شاعری کے متعلق ایسی بہت سی باتیں کر کے دسمبر ۱۹۵۴ء میں سویت ادیبوں کی دوسری کانگرس کے لئے ماسکو پہونچا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ سویت یونین میں تہذیب اور ادب مٹھی بھر خوش قسمت انسانوں کی

www.taemeernews.com

جائداد نہیں ہیں اور پانی اور ہوا کی طرح عام ہو چکے ہیں۔ میں وہاں کے آدمیوں کی ادب دوستی دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ روز کسی نہ کسی نئے واقعے سے میری حیرانی میں اضافہ ہو جاتا تھا۔

ایسا ہی ایک دل چسپ واقعہ ماسکو کے باکو ریسٹوران میں پیش آیا۔ یہ ریسٹوران میری مترجم الکزنڈرا کو زیادہ پسند نہیں تھا۔ اس لئے میں وہاں چاہے جب کباب اور نان کھانے کے لئے پہونچ جاتا تھا اور اشاروں سے اپنا کام چلا لیتا تھا کبھی کبھی خواجہ احمد عباس بھی میرے ساتھ ہوتے تھے۔ اور ٹوٹی پھوٹی روسی بول کر کام چلا لیتے تھے۔

ایک شام کو چلی (جنوبی امریکہ) کے شاعر پابلو نرودا اور انگریزی ناول نگار اور نقاد جیک لنڈسے بھی ہمارے ساتھ شریک ہو گئے۔ پابلو نرودا ایک کھوئی کھوئی سی دل آویز شخصیت کا مالک اور ہسپانوی زبان کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ اور پکاسو کی تصویروں، اپنے ملک کے پہاڑوں، سمندروں، پھولوں اور ہندوستانی حسن کا عاشق ہے۔ اس کی شاعری بے حد حسین اور مترنم ہے۔ اور اتنی ہی انقلابی۔ چلی کے کان کھودنے والے مزدوروں سے لے کر سویت یونین کے عوام تک ہر شخص اسے جانتا ہے۔ کسی زمانے میں اس کے سر پر موت کی تلوار لٹک رہی تھی اور وہ دیس بدیس مارا مارا پھر رہا تھا، اب اس کے سر پر شہرت اور عظمت کا تاج رکھا ہے اور وہ خواب آلود لہجے میں بات کرتا ہے، جیسے کہیں دور پانی برس رہا ہو یا صنوبر اور چیر کے درختوں سے ہوا آہستہ آہستہ گذر رہی ہو۔ وہ اسپین کی خانہ جنگی میں بارود کی بو سونگھ چکا ہے۔ اور خون کا رنگ دیکھ چکا ہے۔ لیکن اس کا سانس دنیا کے نہ جانے کتنے ملکوں کے پھولوں کی خوش بو سے بسا ہوا ہے۔ اور یہ خوشبو اس کی نغموں میں منتقل ہو جاتی ہے۔

جب ہم باکو ریسٹوران میں داخل ہوتے تو کوئی آذربائیجانی نغمہ بج رہا تھا،

www.taemeernews.com

لیکن ہماری صورت دیکھتے ہی ساز پر "آوارہ" کا گیت بجنے لگا۔ یہ محبت اور دوستی کا ایک خوب صورت اشارہ تھا، ریسٹوران بھرا ہوا تھا لیکن سوویت والوں نے اپنے مہمانوں کے لئے جگہ خالی کر دی اور ہم لوگ ایک میز کے گرد بیٹھ گئے۔ گورکی انسٹی ٹیوٹ (جہاں تخلیقِ ادب اور شاعری کی تعلیم دی جاتی ہے۔) کے دو ادیب طالب علموں نے ہمیں دیکھا۔ ایک نوعمر لڑکی تھی اور ایک لڑکا۔ دونوں نے آپس میں کچھ سرگوشی کی۔ لڑکی کا چہرہ تمتما اٹھا اور گالوں میں ہنسی کے بھنور گہرے ہو گئے۔ پھر دونوں ہماری میز پہ چلے آئے۔ آہستہ آہستہ محبت کا یہ حلقہ وسیع ہوتا گیا۔ نان، کباب، شوربے میں سے ایشیا کی خوشبو آ رہی تھی۔ اور چاروں طرف چہروں پر سوویت کی محبت کے پھول کھل رہے تھے۔ یہ مسکراہٹیں ہی ہمارے درمیان مشترک زبان کام کر رہی تھیں، شاشلک اور لولا کباب چکھ کر نرودا کو جامع مسجد دہلی کے مرچ بھرے چٹ پٹے کباب اور پراٹھے اور موتی محل کا پلاؤ یاد آ گیا۔ (پبلو نرودا ۱۹۵۱ء میں ہندوستان آئے تھے)

یکایک برابر کی ایک میز پر شمپین کا کاگ اڑا۔ ہم نے مڑ کر دیکھا دو لمبے قد اور چھریرے بدن کے آرمینی وہاں سے اٹھ کر ہمارے پاس آئے اور بغیر کچھ کہے ہوئے میرا اور احمد عباس کا ہاتھ پکڑ کر ہمیں اپنی میز پر لے گئے۔ دونوں نے اشاروں سے نرودا اور جیک لنزے سے معافی مانگی اور پھر ہماری طرف مخاطب ہو گئے۔ انھوں نے پہلے روسی زبان میں کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن جب میں نے اور احمد عباس نے کہا "یا نیے گوار و پاروسکی" (میں روسی نہیں بولتا) تو وہ شاید آرمینی زبان بولنے لگے۔ ہم نے تفریحاً انھیں اردو میں جواب دیا اور ہم چاروں ہنسنے لگے۔

پھر ان میں سے ایک نے گلاسوں میں شمپین انڈیلی اور تراشے ہوئے نفیس بلور کے جاموں میں پگھلا ہوا سونا مسکرانے لگا، گلاسوں کو ہاتھ میں لے کر اور ہماری طرف اشارہ کر کے کہا "اندسکی (ہندوستانی) اور اپنی طرف اشارہ کر کے کہا آرمینیا۔ انجینیر" میں نے اور احمد عباس نے اپنے نام بتائے، ان دونوں میں سے ایک نے کہا "میر" (امن)

www.taemeernews.com

اور دوسرے نے کہا "نہرو"۔ پھر دونوں نے اپنے اپنے جام ہوا میں بلند کر کے ایک ساتھ حافظ کا شعر پڑھا ؎

اگر آن ترک شیرازی بدست آرد دل ما را
بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

اس کے ساتھ انھوں نے ہندوستان، نہرو اور امن کا جام پی لیا۔

میں آج بھی سوچتا ہوں اور محسوس کرتا ہوں کہ یہ جام کتنا حسین تھا۔ ان دونوں کو فارسی نہیں آتی تھی، لیکن حافظ کا شعر یاد تھا۔

معلوم نہیں اس کہانی کی کوئی تاریخی حیثیت ہے یا نہیں لیکن یہ مشہور ضرور ہے کہ حافظ شیرازی کے اس شعر پر تیمور لنگ نے حافظ سے یہ کہا تھا کہ "میں نے اتنی محنت سے سمرقند اور بخارا کو آراستہ کیا اور تم نے اپنے معشوق کے چھوٹے سے تل پر ان شہروں کو نثار کر دیا، حافظ نے جو بھی جواب دیا ہو لیکن یہ نہ تیمور کو معلوم تھا اور نہ حافظ کو کہ ایک دن یہ عاشقانہ شعر سیاسی پہلو بھی اختیار کرلے گا اور سمرقند و بخارا امن عالم کی قیمت قرار پا جائیں گے۔

حافظ نے سمرقند اور بخارا کو محبوب کے رخسار کے ایک چھوٹے سے تل پر نچھاور کر دیا، اور آج کے دو آرمینی انجینیروں نے امن عالم کے لئے یہ شہر ہندوستان اور نہرو کے حوالے کر دیئے۔ یہ تیمور اور دنیا کے سارے جنگ جو حکمرانوں کی شکست ہے اور خالِ محبوب اور امنِ عالم کی فتح۔

دہلی ۱۹۵۸ء

www.taemeernews.com

گلینا

گول سا چہرہ جو غور سے دیکھنے پر بھدا معلوم ہوتا تھا۔ چھوٹا سا قد اور ذرا گداز جسم۔ عمر اڑتیس سال۔ یہ گلینا تھی۔ دل کے امراض کی ڈاکٹر۔ میں نے جب اسے پہلی بار دیکھا تو مجھے اس میں کوئی خصوصیت نظر نہیں آئی۔ وہ کروڑوں عورتوں کی طرح ایک عورت تھی اور ہزاروں ڈاکٹروں کی طرح ایک ڈاکٹر۔ اور سوویت یونین میں زیادہ تر عورتیں ہی ڈاکٹر ہوتی ہیں۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ کمیونسٹ پارٹی کی ممبر ہے اور گذشتہ جنگ میں جرمنوں کے خلاف لڑ چکی ہے۔ یہ بھی کوئی خاص بات نہ تھی میں ملنے کے بعد فوراً اسے بھول گیا۔ نئے نئے چہرے سینما کی تصویروں کی طرح میری آنکھوں کے سامنے سے گذرتے رہے۔ لیکن پھر ایک دن۔

ایک دن کیا ہوا اس کے لئے مجھے ایک پوری کہانی کہنی پڑے گی اور یہ کہانی ان تمام کہانیوں کی طرح خوب صورت اور حیرت انگیز ہے، جن کے کردار اور واقعات عام زندگی سے آتے ہیں۔ زندگی سب سے بڑی افسانہ نگار ہے۔

گلینا نے اپنی عمر میں بہت سے مریض دیکھتے تھے۔ کسی کا دل بڑھ گیا تھا کسی کے دل کا کوئی گوشہ چھوٹا ہو گیا یا بند ہو گیا تھا۔ کوئی دل زیادہ دھڑکتا اور کوئی کم۔ اور جنگ کے زمانے میں تو اس نے ایسے دل بھی دیکھے تھے۔ جن کے ٹکڑے ہو گئے تھے، نہ جانے کتنے دلوں کے دھڑکتے ہوئے ٹکڑے اپنے ہاتھوں میں اٹھائے تھے، لیکن

www.taemeernews.com

گلینا کا نیا مریض سب سے زیادہ عجیب و غریب تھا۔ اسے دل کی بیماری تھی، وہ شاعر تھا۔ اور ایک دور دراز مشرقی ملک سے آیا تھا، جوانی میں اس نے اپنے ملک کی تحریکِ آزادی میں حصہ لیا تھا، لیکن آزادی کے بعد اس کا ملک دوبارہ سامراجی سازشوں کے جال میں پھنس گیا، اور آزادی کا یہ جواں سال سپاہی جواب شاعر اور ادیب بن چکا تھا۔ اپنے آزاد ملک کے قید خانے میں بند ہو گیا، جیل سے باہر نکل کر اسے اپنے وطن میں روپوش ہونا پڑا۔ وہ انسانوں کے ہجوم میں ایک تنہا پرچھائیں کی طرح گھومتا رہا، اور اس کی شاعری ایک سنہری شعلے کی طرح کروڑوں دلوں کو حرارت بخشتی رہی اور کروڑوں دلوں کے اندر نور اور حرارت بن کر اتر جانے کے جرم میں اسے ایک دن پھر گرفتار کر لیا گیا اور وہ تیرہ سال تک لوہے کی سلاخوں اور پتھر کی دیواروں میں اسیر رہا۔ نہ جانے کتنے سال اس نے سورج کی روشنی اور آسمان کا نیلا رنگ نہیں دیکھا، اور ایک دن جب اسے تھوڑی دیر کے لئے کال کوٹھری سے باہر نکالا گیا۔ تو اس نے بیتاب ہو کر کہا "آسمان کے جگمگاتے نیلم سے زیادہ حسین کوئی چیز نہیں ہے۔ یہی میری آزادی ہے۔ یہی میری محبوبہ"۔ اور آسمان کے نیلے رنگ سے محبت کرنے کے جرم میں اسے پھر کال کوٹھری میں ٹھونس دیا گیا، وہاں اس کا دل تنہا دھڑکتا رہا اور تنہا دھڑکتے دھڑکتے بیمار ہو گیا۔ یہ بیمار دل اس کی تندرست و توانا اور خوب صورت نظموں کی شکل میں سنگینوں کے پہرے سے باہر نکلا اور ساری دنیا میں پھیل گیا۔ اس آواز کو سن کر مہذب انسانیت چیخ اٹھی اور آخر جیل میں بند شاعر کے قومی حکمراں اسے تیرہ سال کے بعد رہا کرنے پر مجبور ہو گئے۔

تیرہ سال بعد اس نے چاند اور سورج کو آزاد دیکھا، ان کے چہروں پر لوہے کی سلاخوں کے نشان نہیں تھے۔ تیرہ سال بعد اس نے اپنے شہر کی تنگ و تاریک گلیوں میں دوبارہ قدم رکھا، اور خوانچے والوں کی رسیلی آوازیں سنیں۔ اور ترکاریوں کا تازہ رنگ اور پھولوں کی بھینی خوشبو محسوس کی، تیرہ سال بعد اس نے اپنی بیوی کو پیار کیا،

www.taemeernews.com

لیکن اس کا دل بیمار تھا، جس کے لئے اسے علاج اور آرام کی ضرورت تھی، اور یہ اسے اپنے ملک اور عزیز وطن میں نصیب نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی عام مقبولیت اس کی دشمن تھی۔ سرکاری جاسوسوں کی پرچھائیاں اس کے پیچھے پیچھے تھیں اور لوہے کی ہتھکڑیاں اور جیل کی زنجیریں اس کے ہاتھوں اور پیروں کو ڈھونڈھ رہی تھیں۔ بیمار شاعر اپنے علاج کے لئے سوویت یونین آگیا۔ ویسے اس کی عمر زیادہ نہ تھی۔ پچاس سے کچھ ہی اوپر تھی۔ لیکن دل کی بیماری نے اسے بوڑھا کر دیا تھا۔

گلینا کے ہاتھوں میں علاج کے لئے ایسا دل کبھی نہیں آیا تھا جو اتنا بیمار تھا کہ اس کے دھڑکنے پر حیرت ہوتی تھی، پھر بھی اتنا زیادہ تھا کہ کوئی دل اتنا زندہ نہیں ہو سکتا وہ ڈاکٹر سے ایسی باتیں کرتا تھا جو اس نے کبھی نہیں سنی تھیں "تم میرے دل کا علاج کیا کرو گی۔ میرے سینے میں دل کہاں ہے۔ وہ تو دنیا کے مختلف حصوں میں بکھرا ہوا ہے۔" پھر وہ کبھی اس دل کی باتیں کرنے لگتا جو اس کے پہلو میں تھا۔ "میرے سینے میں جو دل ہے وہ نگینے کی طرح ہے۔ اس میں کتنے ہی عکس دکھائی دے رہے ہیں، اس میں میری بیوی کا دمکتا ہوا رخسار ہے۔ میرے بچے کی ننھی سی مسکراہٹ ہے جو میرے چلے آنے کے چند مہینے بعد پیدا ہوا، اور جس کی صورت میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ اس میں ہندوستانی کسانوں کے جھونپڑوں کے چراغ جگمگا رہے ہیں اور ایران اور افریقہ کے شہیدوں کا خون شفق کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ جمشید کا جام ایک افسانہ تھا، اور میرا دل ایک حقیقت ہے، اور ہر زمانے کا دل حقیقت ہوتا ہے۔ جمشید کے جام سے بڑی اور زیادہ قیمتی حقیقت۔" یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں کے نیلے فرشتے ہنسنے لگتے۔ اور جب وہ چپ ہو جاتا تو دونوں آنکھیں دو بڑے پیارے اور مہذب بچوں کی طرح پلکوں کے نیچے سے جھانکنے لگتیں، اور گلینا خاموشی سے اس کے خون کا دباؤ دیکھتی رہتی اور بجلی سے اس کے دل کی دھڑکنوں کا نقشہ بناتی رہتی اور پھر مسکرا کر کہتی "کون کہتا ہے تمہارا دل بیمار ہے۔" اور اس بات کا یقین نہ شاعر کو آتا نہ ڈاکٹر کو کیوں کہ اس فقرے کے فوراً ہی بعد گلینا اس کے ایک

www.taemeernews.com

انجکشن لگا دیتی تھی۔

"دل ہی تو سب کچھ ہے۔ ہماری مشرقی شاعری میں اگر دل بیمار نہ ہو اور اس میں درد نہ ہو تو شاعر شعر ہی نہیں کہہ سکتا۔ تم میرا علاج کر کے میری شاعری چھین لینا چاہتی ہو" یہ کہتے کہتے وہ گلینا کے ہاتھ سے گلاس لے کر اپنی دوا پی لیتا تھا۔

مریض کو سیڑھیاں چڑھنے کی اجازت نہیں تھی کیوں کہ اس سے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی۔ لیکن جب اس کا کوئی دوست یا چاہنے والا کہیں سے آجاتا تو وہ اسے پہلی منزل کا کمرہ دکھانے ضرور لے جاتا جو طرح طرح کی چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔ مختلف زبانوں کی ہزاروں کتابیں جو بار بار محبت بھری انگلیوں کا لمس اور نیلی نیلی شفاف آنکھوں کی حرارت محسوس کر چکی تھیں۔ اور ساری دنیا کے عوامی فن کے نمونے، مٹی کے گھوڑے، لکڑی کے کھلونے، شوخ رنگوں کی تصویریں، کاغذ کے پھول، اور پیراشی کی میزیں اور اس طرح کی دوسری بے شمار چیزیں جن میں ہندوستان کی اپسرائیں، کوہ قاف کی پریاں، چین کے افسانوی عفریت، اور مغربی ممالک کے عوامی فن کی دیویاں رہتی تھیں، وہاں کی دیواروں اور میزوں پر وہ دستکاریاں جمع تھیں جن کے معیارِ حسن نے صدیوں کے ذوقِ جمال کی تربیت کی ہے۔ وہاں فطرت کی رعنائیاں اور افسانوں کے خواب رنگوں میں اسیر تھے۔ اور بیمار شاعر اپنے دوستوں اور مہمانوں کو ایک ایک چیز بڑے شوق سے دکھاتا تھا، جیسے کہہ رہا ہو کہ "دیکھو یہ سب میری تنہائی کے ساتھی ہیں"۔ پھر وہ انھیں چیزوں کے مطابق روسی موسموں کی باتیں کرنے لگتا، جیسے وہ بھی اس کے رفیق ہوں، موسم جو سال میں کئی بار بدلتے اور کبھی اس کے لئے پھولوں اور خوشبوؤں کا تحفہ لاتے۔ کبھی پھلوں کی سوغات، کبھی ٹھنڈی ہواؤں کا نذرانہ اور کبھی فضاؤں میں اڑتی ہوئی برفانی پریوں کی روپہلی مسکراہٹ، پہلی بار جب میں ماسکو سے تیس چالیس میل دور پائن اور فر کے جنگلوں کے اندر لکڑی کے بنے ہوئے چھوٹے سے مکان میں اس سے ملنے گیا تھا، تو جاڑوں کا موسم اپنے شباب پر تھا، حدِ نظر تک برف ہی برف

www.taemeernews.com

جمی ہوتی تھی اور قد آور درختوں نے برف کے سفید گالے اوڑھ رکھے تھے، اور شاعر نے بند کھڑکی کے شیشے میں سے اشارہ کرتے ہوتے کہا تھا کہ "یہ سفید سنتری یہاں کی پریوں کے محافظ ہیں، اور شام سے صبح تک اور صبح سے شام تک کھڑے رہتے ہیں کبھی کبھی جب تیز ہوا چلتی ہے تو یہ گاتے ہیں ورنہ خاموشی سے سانس لیتے رہتے ہیں۔ میرا دل انھیں کی طرح جوان ہے"۔ وہ اپنے کمرے کی خوب صورت چیزیں اور باہر کے مناظر کی باتیں اس طرح مسلسل کرتا جیسے کوئی پہاڑی چشمہ بہہ رہا ہو اور پھر باتیں کرتے کرتے ایسے جوش میں آجاتا تھا کہ ڈاکٹر کو اسے ٹوکنا پڑتا تھا، دراصل اسے سیڑھیاں چڑھنے ہی کی نہیں بلکہ زیادہ باتیں کرنے کی بھی ممانعت تھی۔

گلینا نے دل کے اس مریض کو فکروں سے بھی آزاد رہنے کی تاکید کی تھی، لیکن وہ اپنے لئے پریشانی کا کوئی نہ کوئی سامان کرتا ہی رہتا تھا۔ جب اسے چپ رہنے کو کہا جاتا تو وہ فوراً چپ ہو جاتا تھا اور اپنے مہمانوں سے جو زیادہ تر دوسرے ممالک کے شاعر، ادیب اور سیاست داں ہوتے تھے، فرمائش کرتا تھا کہ وہ اپنے ملکوں کا حال سنائیں تاکہ وہ خود خاموش رہ سکے، اس پر ڈاکٹر بھی خوش ہو جاتی تھی، اور دوڑ دوڑ کر مہمانوں کی خاطر کرنے لگتی تھی، کبھی ان کے لئے قہوہ بنا کر لاتی تھی، کبھی ان کے جام میں شراب انڈیلتی تھی کبھی انھیں سگریٹ پیش کرتی تھی، اور کبھی سنترے سیب اور ناشپاتیاں چھیل چھیل کر کھلاتی تھی، اس وقت ڈاکٹر کے بجائے گھر کی منتظمہ بن جاتی تھی، اور شاعر مہمانوں کی باتوں میں اتنی دلچسپی لیتا تھا، گویا وہ خود اپنے گھر والوں کا حال سن رہا ہے، وہ بمبئی کے مزدور ہوں یا کلکتہ کے رکشہ والے، ہندوستانی ادیب ہوں یا امریکی سائنس داں، مصر اور ترکی کے مجاہد ہوں یا افریقہ اور ملایا کے جانباز سب اسے اپنے عزیزوں کی طرح عزیز تھے، اور ان کی مصیبت اور جانبازی کی داستانیں سنتے سنتے اس کی آنسو آجاتے تھے، کبھی غصّے سے اس کا چہرہ تمتما اٹھتا تھا، اور کبھی انتہائی خوشی کے عالم میں وہ قہقہہ مار کر ہنستا تھا، اور دونوں حالتیں اس کے

www.taemeernews.com

دل کے لئے خطرناک تھیں، اور جب گلینا اسے پھر روکتی تھی، تو وہ یہ کہہ کر اپنے آپ کو سنبھال لیتا تھا۔ "مگر شاعر کا دل فکروں سے آزاد کیسے ہو سکتا ہے"۔

اور گلینا اس بات کو اچھی طرح سمجھتی تھی کہ شاعر کے دل کو فکروں سے آزاد نہیں کیا جا سکتا حالانکہ ڈاکٹری اعتبار سے شاعر کا دل اور غیر شاعر کا دل ایک سا ہوتا ہے وہی گوشت کا ایک لوتھڑا جو اپنی مسلسل حرکت سے رگوں میں گرم اور سرخ خون دوڑاتا رہتا ہے۔

اس کے علاج کے لئے اسے تنہا بھی نہیں رکھا جا سکتا تھا، کیوں کہ تنہائی میں اس کا دل اور بھی بے قابو ہو جاتا تھا، اور ہر دھڑکن ایک نغمہ بن جاتی تھی، نغموں سے مصرعے، مصرعوں سے شعر اور شعروں سے نظمیں بن جاتی تھیں، یہ نظمیں اس ننھی لڑکی پر آنسو بہاتی تھیں جو ہیروشیما میں ایٹم بم کا شکار ہوئی تھی۔ جس کے بال جل گئے تھے اور آنکھیں زہریلے دھوئیں سے اندھی ہو گئی تھیں، جو چھ سال کی تھی، اور اب دس سال بعد بھی چھ سال کی تھی، کیونکہ مرنے والے بڑے نہیں ہوتے، اور اب یہ چھ سال کی لڑکی دنیا کے ہر انسان کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی، اور اس لئے اس کے دل اور اس کے نام کی بھیک مانگ رہی تھی تاکہ دوسری لڑکیاں چھ برس کی نہ رہ جائیں، یہ نظمیں ان جاپانی ماہی گیروں کا درد محسوس کرتی تھیں جن کی کشتیوں پر ہائیڈروجن بم کی راکھ برسی تھی جو اب اپنی بیویوں کو پیار نہیں کر سکتے تھے، کیوں کہ یہ محبت کا بوسہ اب موت کا بوسہ بن چکا تھا۔

آخر ایک دن شاعر کے دل نے جواب دے دیا، پہاڑی چشموں کی طرح گاتی ہوئی آواز سرگوشیوں میں تبدیل ہو گئی، گلینا نے مریض کو دیکھا تو اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا، شاعر کا تھکا ہوا دل آرام کرنا چاہتا تھا۔ گلینا اپنے آنسو پی گئی۔ اور ایک انجکشن لگا کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

تھوڑی دیر بعد اس گھر میں دل کے ماہر ڈاکٹروں کی کانفرنس ہو رہی تھی، اور

www.taemeernews.com

سب نے یہ فیصلہ کر دیا کہ مریض کا آخری وقت آگیا ہے۔ شاعر کا تھکا ہوا دل آرام کرنا چاہتا ہے۔ گلینا نے رُندھی ہوئی آواز میں اپنے آپ سے کہا "اب کوئی امید باقی نہیں"۔ رخصت ہوتے ہوتے ایک بوڑھے ڈاکٹر نے اسے تسلین دینے کی کوشش کی "ویسے کوئی امید نہیں ہے لیکن اگر مریض کے جسم میں بیماری سے لڑنے کی طاقت باقی رہ گئی ہے تو بچ جانے کا امکان ہے"۔ گلینا نے مایوسی سے سر ہلایا اور پھر اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لئے بولی "ہاں آخری وقت آخری کوشش کے لئے ساری بچی ہوئی طاقتیں ایک ساتھ عود کر آتی ہیں"۔

ڈاکٹروں کے جانے کے بعد گلینا شاعر کے ویران گھر میں کھوئی کھوئی سی گھوم رہی تھی۔ پہلے اس نے اس کمرے میں جھانک کے دیکھا جس میں مریض کی سانس بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھی، پھر پنجوں کے بل چلتی ہوئی وہ دوسرے کمرے میں گئی پھر تیسرے کمرے میں پہونچی۔ شاعر کے ہاتھ کے سجاتے ہوئے مجسمے اور تصویریں ننھی ننھی چیزیں انسان کے ہر غم سے بے خبر اب بھی جگمگا رہی تھیں، گلینا نے الماری میں سے کئی کتابیں نکالیں ان میں شاعر کی خود اپنی لکھی ہوئی کتابیں بھی تھیں، اس نے انھیں بڑی محبت کے ساتھ اپنے رومال سے صاف کیا حالانکہ ان پر گرد کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ پھر اس نے آہستہ سے ایک کتاب کھولی۔ یہ شاعر کا دیوان تھا۔ کھلے ہوئے صفحے پر لکھا تھا:

بھائیو!
میں مرنا نہیں چاہتا۔
وہ مجھے قتل کر دیں گے تو میں تمہارے دلوں میں زندہ رہوں گا۔
میں آراگون کی نظموں میں زندہ رہوں گا۔
ان مصرعوں میں جو آنے والے خوب صورت دنوں کی بشارت دیتے ہیں۔
میں پکاسو کے فن میں زندہ رہوں گا۔

www.taemeernews.com

روبسن کے گیتوں میں زندہ رہوں گا۔

اور سب سے زیادہ۔

اور سب سے بہتر طریقے سے۔

میں اپنے رفیقوں کے کامیاب و کامراں قہقہوں میں زندہ رہوں گا۔

یہ نظم شاعر نے اپنے وطن کی جیل میں بھوک ہڑتال کے پانچویں دن لکھی تھی، گلینا کو یاد آیا کہ بھوک ہڑتال کے وقت بھی شاعر کے بیمار دل کی یہی حالت ہو گئی تھی، وہ فیصلہ نہ کر سکی کہ یہ نظم شاعر کے مرنے کی خبر دے رہی ہے یا زندہ رہنے کی۔ وہ کتاب کو الماری میں بڑی احتیاط سے رکھ کر نیچے اتر آئی۔ اب وہ کھانے کے کمرے میں کھڑی تھی۔ میز پر روسی دست کاروں کے بنائے ہوئے لکڑی کے سرخ، نیلے اور سنہرے پھولوں سے سجے ہوئے چمچے رکھے تھے، الماریوں میں سے حسین و جمیل برتن جھانک رہے تھے، دیوار پر لگی ہوئی لکڑی کی ایک گھڑی میں بیٹھی ہوئی ایک چڑیا گا رہی تھی۔ اور شیشے کی بڑی سی کھڑکی پر کئی گلدان اور گملے رکھے ہوئے تھے اور کھڑکی کے باہر سفید برف کا منظر تھا، گلینا بڑی دیر تک ایک ایک پودے کو اپنے ہاتھوں سے چھوتی رہی اور پھر ایک ایسے گملے کے سامنے رک گئی جس میں پودے کے بجائے صرف ایک ٹھونٹھ کھڑا تھا۔ خزاں کے موسم میں اس کی پتیاں جھڑ چکی تھیں اور بہار کے آنے میں ابھی دیر تھی، گلینا پھول اور پتیوں سے عاری اس لکڑی کے سوکھے ٹکڑے کو دیکھتی رہی اور پھر نہ جانے کیا سوچ کر اس نے میز سے پانی کا جگ اٹھا کر گملے میں انڈیل دیا، تھوڑا سا پانی گملے میں سمایا اور باقی چھلک کر اس کے دامن اور زمین پر گرا۔

گلینا خالی جگ میز پر رکھنے کے لئے مڑی تو دیکھا کہ وہاں نتاشا کھڑی ہوئی ہے، س کی بیس بائیس برس کی جوان آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ میز پر کھانا سجا رہی تھی۔

"کس لئے؟" گلینا نے حیرت سے پوچھا۔

"جس کے لئے تم سوکھے ہوئے پیڑ میں پانی ڈال رہی ہو"۔ نتاشا جواب دیتے ہوئے

www.taemeernews.com

گلینا سے لپٹ گئی۔

"ایک منزل پر آکر دوائیں بے کار ہو جاتی ہیں اور ڈاکٹر اپنے آپ کو بے بس محسوس کرنے لگتے ہیں"۔ گلینا نے اعترافِ شکست کیا۔

"لیکن امید بھی کوئی چیز ہے"۔ نٹاشا نے کہا۔ "میں نے شاعر کے لئے آج بھی کھانا پکایا ہے"۔

"میں سوچتی ہوں نٹاشا کہ پیڑ سوکھ جاتے ہیں، ان کی پتیاں جھڑ جاتی ہیں لیکن پھر بہار آتی ہے اور سوکھے پیڑوں میں پھول کھل جاتے ہیں، اگر آدمی کے جسم میں بیماری سے لڑنے کی طاقت باقی ہو تو وہ ہر بیماری پر قابو پا لیتا ہے، آخری وقت تمام طاقتیں دوبارہ عود کر آتی ہیں"۔ گلینا نے وہی فقرہ پھر دہرایا جو اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لئے اس نے تھوڑی دیر پہلے بوڑھے ڈاکٹر سے کہا تھا، پھر کچھ رک کر بولی۔ "لیکن بہار لائی بھی جا سکتی ہے"۔

نٹاشا نے بڑی محبت سے گلینا کے رخسارے پر پیار کیا اور باورچی خانے میں چلی گئی، اور گلینا یہ کہتی ہوئی بیمار شاعر کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ "میں تو اپنے دل کو تسکین دے رہی ہوں"۔

شاعر کی سانس بہت آہستہ چل رہی تھی، نبضیں ڈوبی ہوئی تھیں آنکھیں نقاہت سے بند تھیں، یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ سو رہا ہے یا بے ہوش ہے۔

دن ہفتوں میں تبدیل ہو گئے۔ شاعر کی حالت بدستور نازک رہی، نٹاشا دونوں وقت کھانا پکا کر اس کے لئے میز پر سجاتی تھی۔ اس کی محبوب خوب صورت پیالوں میں کئی بار قہوہ انڈیلتی تھی اور گلینا اسے دوائیں دیتی رہتی تھی، اور سوکھے پودے میں پانی ڈالتی رہتی تھی، دل کے امراض کے ماہر دبے پاؤں آتے تھے اور مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے چلے جاتے تھے۔

"بہار کے موسم میں ابھی کتنے دن باقی ہیں"۔ گلینا چاہے جب نٹاشا سے پوچھتی۔

www.taemeernews.com

اور ٹاشا اپنا پرانا جواب دہرا دیتی دن نہیں مہینے ابھی تو خزاں کا موسم ختم ہوا ہے۔ اب برف باری ہو رہی ہے، پھر زمین اور آسمان پر برف جم جائے گی، پھر ٹھنڈی ہوائیں چلیں گی اور وہ آسمان سے بادلوں کو ہنکا دیں گی اور پھر سورج کی کرنیں زیادہ گرم ہو جائیں گی، اور برف پگھلنے لگے گی اور زمین میں برف کے نیچے سے گھاس کی ننھی ننھی انگلیاں باہر نکلیں گی اور ہواؤں میں خوشبو پھیل جائے گی۔ سوکھے ہوئے درختوں میں نئی نازک نازک پتیاں آئیں گی اور پھر سخت ڈنٹھل کو توڑ کر ایک نرم کلی باہر نکلے گی، پھر دوسری کلیاں اور سارا جنگل پھولوں سے بھر جائے گا۔ اور شاعر اچھا ہو جائے گا۔"

"اتنے دن زندہ رہنا مشکل ہے۔ ایک ایک رات بھاری ہو رہی ہے۔ ڈاکٹری اعتبار سے اس دل میں اب کچھ نہیں رکھا ہے، لیکن جسم کی طاقت بیماری سے لڑ رہی ہے۔" یہ کہہ کر گلینا اپنے آنسو پونچھ لیتی۔

"کیا دوا اس طاقت کو بڑھا سکتی ہے؟" ٹاشا پوچھتی۔

"کیوں نہیں"۔ گلینا بڑے اعتماد سے جواب دیتی۔

"اگر دوائیں اس طاقت کو بڑھانے میں کامیاب ہو گئیں تو میں شاعر کو بچا لوں گی۔"

ایک دن ایک ننھے سے بچے کی تصویر آئی جو نہ جانے کیسے شاعر کے وطن سے باہر نکلی تھی اور دنیا کے مختلف ملکوں کا چکر لگاتی ہوئی یہاں پہونچی تھی، گلینا نے لفافہ کھولا، تصویر کے نیچے بچے کا نام لکھا ہوا تھا "محمد"۔ گلینا اس معصوم نام سے واقف تھی، وہ تصویر لے کر کمرے میں گئی، اس کی نبضیں ڈوبی ہوئی تھیں، سانس بہت آہستہ چل رہی تھی اور آنکھیں نقاہت سے بند تھیں، گلینا نے تمام ڈاکٹری اصول بالائے طاق رکھ کے شاعر کو ہولے سے آواز دی، اس کا شانہ ہلا کر کہا "محمد کی تصویر آئی ہے۔" شاعر نے اپنی نحیف آنکھیں کھول دیں اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے تصویر ہاتھ میں

www.taemeernews.com

لے لی. تصویر ہاتھ میں آتے ہی اس کے جسم پر بڑے زور کا رعشہ طاری ہوا اور تصویر چھوٹ کر اس کے سینے پر گر گئی، آنکھیں پھر بند ہو گئیں، گلینا اور دوسرے ڈاکٹروں نے جو وہاں موجود تھے گھبرا کر نبض دیکھی، وہ اور ڈوب چلی تھی. آخری وقت آ گیا تھا. تمام ڈاکٹروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا لیں. بوڑھے ڈاکٹر نے گلینا کو سہارا دے کر کمرے سے باہر نکالا۔ "ڈاکٹروں کو اتنا جذباتی نہیں ہونا چاہیئے"۔

"میں جذباتی نہیں ہوں، میں جرمنوں کے خلاف لڑ چکی ہوں"۔ گلینا نے احتجاج کیا۔ "کوئی ڈاکٹر اپنی شکست برداشت نہیں کر سکتا، اور ہر موت کسی نہ کسی ڈاکٹر کی شکست ضرور ہوتی ہے. میں نے جو دوا دی ہے اسے کام کرنا چاہیئے"۔

یہ کہتی ہوئی گلینا کھانے کے کمرے میں چلی گئی اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی. سوکھے ہوئے پودے میں ایک ننھی سی کلی مسکرا رہی تھی، اسے دیکھتے ہی گلینا پاگلوں کی طرح قہقہہ مار کر ہنسنے لگی، اور یہ بھول کر کہ وہ خود ڈاکٹر ہے، اور مریض کی حالت نازک ہے وہ دوڑتی ہوئی اس کے کمرے میں گئی اور اس سے لپٹ گئی۔

"تم اچھے ہو جاؤ گے، تم اچھے ہو جاؤ گے. پھول کھل گیا ہے"۔ وہ بالکل بچوں کی طرح ہر لفظ کو توڑ توڑ کر بول رہی تھی۔

ڈاکٹروں نے اسے پھر سہارا دے کر کمرے سے باہر نکال دیا۔

مریض کی نبضیں دوسرے دن صبح تک ڈوبی رہیں اور پھر ابھرنے لگیں اور کئی گھنٹے بعد شاعر نے آنکھیں کھول کر پوچھا "گلینا تم ہنس کیوں رہی تھیں"۔

بوڑھے ڈاکٹر نے گلینا کو یاد دلایا "میں نہ کہتا تھا کہ جسم میں بیماری سے لڑنے کی طاقت باقی ہے"۔ ہماری دواؤں نے اسے اور بڑھا دیا"۔

شاعر نے اچھے ہو جانے کے بعد گلینا سے کہا "تم نے پھول کھلا کر میری جان بچائی ہے"۔

گلینا نے صرف اتنا جواب دیا "شاعر کا دل خود پھول ہوتا ہے، لیکن وہ موت سے بھی

www.taemeernews.com

لڑ سکتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تمہارے دل میں اتنی طاقت ہے"۔

"ہاں میں مرنا نہیں چاہتا"۔ یہ شاعر کی اپنی ہی نظم کا مصرعہ تھا۔ "محمد میرا انتظار کر رہا ہے"۔

اپنے کھانے کی میز پر بیٹھ کر ترکی کے عظیم شاعر ناظم حکمت نے اپنی ڈاکٹر گلینا کا یہ واقعہ مجھے سنایا۔ "ابلے ہوئے چاول اور کشمش کو انگور کی پتیوں میں لپیٹ کر تل دیا گیا تھا۔ پھر انھیں انگور کے خوشوں کی شکل میں سجا کر پلیٹوں میں رکھ دیا گیا تھا، ناظم حکمت کا ہاتھ ایک خوشے کو چھری سے کاٹتے کاٹتے رک گیا۔ اور وہ اس گملے کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا لائے، جس کی خشک مٹی میں گلینا نے اپنے آنسوؤں سے پھول کھلا دیا تھا ناظم حکمت نے کہا کہ میں خود بھی اس واقعے کو لکھوں گا، لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم بھی اس پر لکھو، یہ بڑا خوبصورت واقعہ ہے"۔

میں نے اس کے حسن کی داد دیتے ہوئے کہا کہ "اگر یہ واقعہ پانچ سات ہزار برس پہلے کے یونان یا ہندوستان میں پیش آیا ہوتا تو اس کے گرد ایک افسانہ بن جاتا، اور ایک حسین دیوی کی تخلیق ہو جاتی اور نہ جانے کتنے آدمی اور کتنی نسلیں اس عقیدے سے تقویت اور تسکین حاصل کرتیں کہ انسان کی زندگی پھولوں میں ہوتی ہے اور عورت کے آنسو برف کے موسم میں بھی پھول کھلا سکتے ہیں، اور دنیا اس دیوی کے مجسموں سے جگمگا اٹھتی اور اجنتا اور ایلورا کی طرح نہ جانے کتنی دیواریں اور کتنے غار اس کی تصویروں سے آراستہ ہو جاتے"۔

"لیکن یہ اشتراکی سماج کا واقعہ ہے"۔ ناظم حکمت نے پھر بولنا شروع کر دیا "اس میں ذرا سی بھی وہم پرستی نہیں ہے۔ گلینا سوکھے پودے میں پانی ڈال کر صرف اپنے دل کو تسکین دے رہی تھی اچھا تو میں دواؤں سے ہوا ہوں۔ یہ اس نئے سماج کی نئی انسانیت کا ایک حسین اظہار ہے"۔

گلینا اس وقت وہاں موجود نہیں تھی۔ میں نے اس کی صورت یاد کرنے کی بہت

www.taemeernews.com

کوشش کی، لیکن وہ اتنی معمولی تھی کہ میں اسے بالکل بھول چکا تھا۔ ناظم حکمت نے کئی بار اس کا حلیہ بیان کر کے مجھے اس کی شکل یاد دلانے کی کوشش کی، مگر ہر بار میرے ذہن میں ایک پندرہ سولہ برس کی لڑکی کی تصویر بن جاتی تھی۔

چھ مہینے بعد گرمیوں کے موسم میں جب میں دوبارہ ماسکو گیا اور ناظم حکمت سے ملنے ان کے گھر پہونچا تو برآمدے میں ایک اڑتیس برس کی عورت نے میرا استقبال کیا، وہ بیٹھی ہوئی کچھ ٹائپ کر رہی تھی۔ میرے پہونچتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور مجھے لے جا کر کھانے کے کمرے میں بٹھا دیا اور پھر دوڑ کر ناظم حکمت کو بلا لائی۔

میں نے پہلا سوال یہ کیا "گلینا کہاں ہے"۔

اس کا جواب خود اس نے ہنس کر دیا "میں ہی ہوں گلینا۔ یاد نہیں رہا پچھلے دسمبر میں پبلو نرودا کے کمرے میں ناظم حکمت کے ساتھ میں موجود تھی"۔ اور اس نے کچھ اس طرح میری طرف دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو "اور کیا کہنا چاہتے ہو"۔

میں نے ناظم حکمت کا بیان کیا ہوا قصہ سنا دیا، وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی اور ایکدم سے پندرہ سولہ برس کی لڑکی میں تبدیل ہو گئی، اس نے الماری سے شراب کی کئی بوتلیں نکالیں اور سامنے میز پر سجا دیں اور میری بات کا جواب دینے کی بجائے ایک بوتل سے گلاسوں میں شراب انڈیلتے ہوئے کہنے لگی "چکھ کے دیکھو کیسی ہیں یہ شرابیں میں نے بنائی ہیں"۔

وہ واقعی بہت اچھی شرابیں تھیں۔ اس کی تصدیق دو اطالوی مہمانوں نے کی جو ابھی ابھی ناظم حکمت سے ملنے آئے تھے۔

میں نے پوچھا "تم شراب بھی بناتی ہو ناظم حکمت تو نہیں پیتے۔ شاید ان کے دل کے لئے اچھی نہ ہو"۔

وہ پھر ہنسنے لگی۔ "میں تو مہمانوں کے لئے بناتی ہوں"۔

ناظم حکمت نے بتایا کہ گلینا آج کل ٹائپ کرنا سیکھ رہی ہے اور ساتھ ساتھ

www.taemeernews.com

ترکی زبان بھی سیکھ رہی ہے۔

گلینا نے اس کی تائید یہ کہہ کر کی کہ "اب میں ناظم کی نظموں کا ترجمہ کیا کروں گی"۔

اس بار عصمت چغتائی بھی میرے ساتھ تھیں اور انھیں اس واقعے میں ایک عورت کی فتح کا احساس تھا۔ میں نے عصمت سے مڑ کر کہا "ہمارے ملک میں ایسے ڈاکٹر کیوں نہیں ہوتے"۔

عصمت کے بجائے اس کا جواب ناظم حکمت نے دیا "ہمارے ملکوں میں بھی ایسے ہی ڈاکٹر ہوتے ہیں لیکن ہم ان کی فیس ادا نہیں کر پاتے"۔

کیا فیس ہوتی ہے ایسے ڈاکٹروں کی" میں نے حیرت سے پوچھا کیوں کہ مجھے معلوم تھا کہ سوویت یونین میں علاج مفت ہوتا ہے اور ڈاکٹروں کو تنخواہ ریاست کی طرف سے ملتی ہے"۔

"اشتراکی سماج" ناظم حکمت نے مسکرا کر کہا "ایسے ڈاکٹر اس فیس کے بغیر نہیں آتے"۔

گلینا اس وقت ہماری پیالیوں میں قہوہ انڈیل رہی ہے۔

میں نے رخصت ہوتے وقت گلینا کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اب میں اس صورت کو کبھی نہیں بھول سکتا، جس میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ گول سا چہرہ جو غور سے دیکھنے پر بھدا معلوم ہوتا ہے۔ چھوٹا سا قد اور ذرا گداز جسم، عمر اڑتیس سال، کروڑوں عورتوں کی طرح ایک عورت، ہزاروں ڈاکٹروں کی طرح ایک ڈاکٹر۔

جب ہماری موٹر روانہ ہوئی تو گلینا برآمدے کے باہر کھڑی ہوئی ہاتھ ہلا رہی تھی۔

ماسکو: جولائی ۱۹۵۵ء

www.taemeernews.com

ذوقِ تعمیر

۳۰ر جولائی ۱۹۵۵ء

ایما کی شربتی آنکھیں بہت دور دیکھ رہی تھیں اور بالوں کا سنہری تاج استالن گراد کے گرم سورج کی روشنی میں جگمگا رہا تھا، اور ہونٹوں کا چھوٹا سا معصوم خم جس میں ابھی کچھ دیر پہلے ایک ننھی سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی کانپ کر رہ گیا تھا، وہ یہ کہہ کر خاموش ہوئی تھی کہ "یہاں ایک ایک چپے کے لئے سینکڑوں بہادروں کا خون بہا ہے کبھی چوٹی پر جرمنوں کا قبضہ ہوتا تھا اور ڈھالوں پر سرخ فوج کا۔ اور کبھی چوٹی پر سرخ فوج ہوتی تھی اور ڈھالوں پر جرمن۔ اس پہاڑی پر اتنی آگ اور اتنا لوہا برسا ہے کہ لڑائی ختم ہونے کے بعد دو برس تک یہاں گھاس نہیں اُگی۔"

یہ پہاڑی استالن گراد کے تقریباً پچاس میل لمبے شہر کے وسط میں واقع ہے، اور اس کا نام ایک تاتاری خاں مماتی کے نام پر مماتیف رکھا گیا ہے۔ بہت سی روایتیں مشہور ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ صدیوں پہلے مماتی خان نے اس پہاڑی پر قبضہ کر لیا تھا، اور کسی کا خیال ہے کہ یہاں اس سفاک خان کو شکست دی گئی تھی، ان روایتوں کی جو بھی حیثیت ہو، لیکن یہ حقیقت ہے کہ استالن گراد کی لڑائی میں اس پہاڑی کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہوئی۔ اس پر جرمنوں کا قبضہ تھا! اور وہ یہاں سے پورے استالن گراد پر بم باری کر سکتے تھے۔ سوویت کے بہادر سرخ سپاہیوں نے والگا کے دوسرے ساحل سے دریا کو پار کر کے اس پہاڑی پر قبضہ کر لیا، لیکن اس کے ہر انچ کے لئے انھیں اپنا خون بہانا پڑا،

www.taemeernews.com

اور جو بات اس پہاڑی کے لئے کہی جاتی ہے وہ پورے استالن گراد پر صادق آتی ہے، غالباً یہ تنہا شہر ہے جس پر جرمنوں کا قبضہ ہونے کے بعد بھی قبضہ نہیں ہوا، کیونکہ شہر کے عام باشندوں نے وقتی شکست بھی ماننے سے انکار کر دیا تھا، یہی وجہ ہے کہ یہاں سے لڑائی کے دھارے کا رخ پلٹ گیا۔

پہاڑی کے ڈھال جن میں جنگی خندقوں اور سویت اور جرمن بموں نے جگہ جگہ بڑے بڑے گڑھے بنا دیئے ہیں۔ یہاں کے ہزاروں میل لمبے میدانوں میں اگنے والے چھوٹے چھوٹے خوشبودار پودوں سے ڈھکے ہوتے تھے۔ جا بجا بڑی بڑی اجتماعی قبریں بنی ہوئی تھیں اور ہزاروں شہیدوں کو اپنے آغوش میں سلائے ہوئے تھیں، سامنے بوڑھے والگا کا پانی اپنے قدیم وقار کے ساتھ بہہ رہا تھا، اور کشتیاں اور جہاز چل رہے تھے، اس کے پہلو بہ پہلو ریل کی پٹریاں بچھی ہوئی تھیں، اور انجن مال گاڑیوں کی مسلسل قطاروں کو لئے ہوئے دوڑ رہے تھے اور ان کی سیٹیوں کی آوازیں تیز ہوا کے شانوں پر لہرا رہی تھیں۔ دور شمال کی طرف دریا کے ساحل پر سرخ اکتوبر نام کے فولادی کارخانے کی چمنیاں اپنے دھوئیں کے بال کھولے نظر آ رہی تھیں اور ان کے پیچھے استالن ٹریکٹر فیکٹری تھی، شہر کا جنوبی حصّہ جو دریا کے کنارے کنارے بہت دور تک چلا گیا ہے، گرد کے دھندلکے میں کھویا ہوا تھا، نیلے آسمان کے سفید بادل اپنی پرچھائیاں زمین کے ننگے سر پر آنچلوں کی طرح اڑھا رہے تھے۔

میں دو چار خوشبودار پودے توڑ کر سونگھ رہا تھا کہ ایما کی آواز پھر سنائی دی "اب ہم اس پہاڑی پر بہت اچھا باغ لگائیں گے"۔

شہیدوں کی قبروں پر کھلے ہوئے پھولوں کی طرف دیکھتے ہوئے نوجوان شاعر یوری نے کہا کہ "یہاں کے میدانوں میں بہت پھول نہیں ہوتے اور ہم اس کمی کو محسوس بھی نہیں کرتے تھے کیوں کہ یہاں اور بھی بہت سی حسین اور دل موہ لینے والی چیزیں ہیں۔ لیکن اب استالن گراد میں ہم نے بہت سے پھول لگائے ہیں اور ابھی اور بہت سے

www.taemeernews.com

پھول لگائیں گے۔"

یوری شاعر ہے۔ اور موسیقی کا عاشق۔ موسیقی اسے ورثے میں ملی ہے۔ اس کی ماں اوپیرا کی گانے والی تھی، استالن گراد پر حملے کے وقت جرمنوں نے اسے مار ڈالا۔ یوری اپنے وطن کی حفاظت کے لئے فوج میں شامل ہوگیا۔ اور نازی فوجوں کا پیچھا کرتے کرتے برلن تک پہنچا۔ برلن میں ایک شام کو جب سرخ فوج نے جرمنوں کے سامنے اپنے ناچ اور گانے پیش کیئے تو یوری نے انھیں باخ کا نغمہ سنایا۔ جرمن باشندے حیران تھے کہ سویت کے سرخ سپاہی جرمن موسیقار باخ کا نغمہ بھی گاتے ہیں۔ اس وقت یوری نے انھیں بتایا کہ جب جرمنوں نے سویت یونین پر حملہ کیا تھا تو ماسکو کے بڑے تھیٹر میں ایک اور جرمن موسیقار ویگنر کا نغمہ گایا جارہا تھا، اب وہی یوری استالن گراد کا شاعر تھا اور میخائیف کی پہاڑی پر کھڑا ہوا پھولوں سے باتیں کررہا تھا۔

یوکرین کی رہنے والی کالی آنکھوں اور کالے بالوں کی اوکسانا جو صورت سے کبھی ایرانی معلوم ہوتی ہے اور کبھی کشمیری، بہت دیر سے خاموش تھی، اور یہ بات اس کی عادت کے خلاف تھی، وہ ماسکو سے میرے ساتھ آئی تھی۔ یورن کی بات سن کر وہ بھی بولی "استالن گراد ہواؤں کا شہر ہے۔ یہاں گرمیوں میں خشک ہوا چلتی ہے اور اس کے ساتھ برف کے مینار ناچتے ہوئے آتے ہیں۔"

"استالن گراد کے لوگ برف کے ناچتے میناروں کو بہت پسند کرتے ہیں"۔ یوری نے اوکسانا کی تائید کی۔

میں نے پوچھا "تم لوگ ان سرد اور خشک ہواؤں میں بھی پھول کھلانے پر آمادہ ہو؟"

یوری مستقبل کے استالن گراد کی باتیں کرنے لگا۔ "ہم اب اسے پانی کا شہر بنا دینا چاہتے ہیں۔ گرم اور خشک ہوائیں زمین کی ساری رطوبت پی جاتی ہیں اس لئے ہواؤں کے شہر کو پانی کا شہر بنانا ضروری ہے۔ والگا کی نہر بن چکی ہے، جس نے ڈان اور والگا کے پانی کو عاشق و معشوق کی طرح ملا دیا ہے۔ اب ہم استالن گراد کے لئے ایک چھوٹا سا

www.taemeernews.com

سمندر بھی بنانے والے ہیں۔ آس پاس کے کھادروں میں جو گڑھے ہیں کچھ تو پاٹ دیئے جائیں گے اور باقی گڑھوں کو ٹھیک کر کے ان میں بہتا ہوا پانی بھر دیا جائے گا اور چھوٹی چھوٹی ندیوں کے جال بچھ جائیں گے، پھر استالن گراد کی آب و ہوا بدل جائے گی، خربوزے اور تربوز کی طرح یہاں انگور بھی پیدا ہونے لگیں گے، کچھ لوگوں نے تو ابھی سے انگور لگانے شروع کر دیئے ہیں، لڑائی سے پہلے یہاں انگور بالکل نہیں ہوتے تھے۔"

اب ہم لوگ اجتماعی قبروں کے پاس سے گزر رہے تھے، وہاں کئی عورتیں ٹہل رہی تھیں۔ ایما جو اب تک گمبھیر تھی مجھے بتانے لگی کہ "یہ عورتیں یہاں شہید ہونے والے سپاہیوں کی مائیں، بہنیں اور بیویاں ہیں۔ یہ ان کی قبروں پر پھول چڑھانے آتی ہیں۔"

"کیا یہاں قبروں کی کوئی پہچان ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں یہ کیسے ممکن ہے۔ عورتیں ہر قبر پہ پھول چڑھا دیتی ہیں، کسی نہ کسی قبر میں ان کے پیارے ضرور ہوں گے۔"

اب اس نے اپنی ٹوٹی ہوئی بات کا سرا پھر پکڑ لیا۔ "اس پہاڑی پر اب بھی بموں اور گولیوں کے ٹکڑے مل جاتے ہیں۔" اس نے اپنے پاؤں سے پاس کے کسی بم یا شل کا ٹوٹا اور جلا ہوا ٹکڑا اٹھا کر مجھے دیا، میں نے بھی دیکھا، ہر طرف چھوٹے چھوٹے ٹکڑے پڑے ہوتے تھے۔

ایما نے پھر بتانا شروع کیا۔ "جنگ کے فوراً بعد ایک امریکی ماہر نے اس پہاڑی پر جنگی ہتھیاں اور کانٹے دار تاروں کے ٹوٹے پھوٹے انبار کو دیکھ کر کہا تھا کہ اس کی صفائی ممکن نہیں ہے۔ اس میں کتنے ہی ایسے بم کے گولے اور شل دبے ہوتے ہیں۔ جن کے پھٹ جانے کا امکان ہے، اس لئے اس پہاڑی کے گرد لوہے کے تاروں کے حصار بنا کر اسے محفوظ کر دینا چاہیئے اور استالن گراد کا نیا شہر یہاں سے دور بسانا

www.taemeernews.com

چاہیئے، لیکن اس کے چند مہینے بعد ہی ٹوٹے ہوئے جرمن ہتھیاروں کا لوہا سرخ اکتوبر کے فولادی کارخانے اور استالن ٹریکٹر فیکٹری میں استعمال ہو رہا تھا اور ٹریکٹروں کی شکل میں ڈھل ڈھل کر باہر نکل رہا تھا۔"

ٹریکٹر کا نام لیتے ہی اس کے ہونٹوں کی معصوم مسکراہٹ واپس آگئی۔ اور سونیکا ایک دانت ہونٹوں کے گوشوں سے جھانکنے لگا۔

میرے ذہن میں یہ سوال آیا کہ یہاں سویت ہتھیاروں کا بھی لوہا رہا ہوگا جس کے جواب میں ایما نے کہا کہ فاشست اور اشتراکی لوہا اس طرح مل گیا تھا کہ دونوں میں تمیز کرنا مشکل تھا۔

جب ہم لوگ وہاں سے موٹر میں بیٹھ کر روانہ ہوئے تو میں نے ایما سے پوچھا کہ وہ لڑائی کے زمانے میں کہاں تھی۔

"استالن گراد میں۔"

"کیا کر رہی تھیں تم؟"

"میری عمر اس وقت تیرہ برس کی تھی۔ میرے باپ شہر کی حفاظت کے لئے فوج میں چلے گئے تھے اور وہیں کام آگئے۔ مجھے میری ماں کے ساتھ والگا کے اس پار بھیج دیا گیا تھا۔ لڑائی کے بعد میں نے اپنی تعلیم ختم کی۔"

مجھے پورے سویت یونین میں ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملا، جس کا کوئی نہ کوئی عزیز لڑائی میں کام نہ آیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ لڑائی کے نام سے ہر شخص کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

استالن گراد کا میوزیم دکھا کر ایما رخصت ہو گئی، اسے اپنے بچوں کے ساتھ تھیٹر جانا تھا۔ یوری اور اوکسانا میرے ساتھ رہ گئے۔

استالن گراد ہمیشہ سے جنگوں کا شہر رہا ہے، قدیم زمانے میں اس نے تاتاریوں کی یورش روکی تھی، انقلاب کے بعد جب چودہ سامراجی ملکوں نے نوعمر سویت یونین پر

www.taemeernews.com

حملہ کر دیا تھا تو استالن گراد نے اپنے انقلاب کی حفاظت کی تھی، اس کے اور گرد کے علاقے نے پوری سویت آبادی کے لئے روٹی مہیا کی تھی اور اس شہر نے انقلاب کی رہنمائی میں انقلاب کے دشمنوں کو شکست دی تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے وقت بھی جب نازی فوجیں بادلوں کی طرح پورے یورپ پر چھا گئی تھیں، اور ساری دنیا کو فاشستوں کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا، اس وقت استالن گراد نے ہٹلری فوجوں کو شکست دے کر لڑائی کے دھارے کا رُخ پھیر دیا تھا۔ استالن گراد کے میدانوں سے پیچھے ہٹتے ہٹتے جرمن فوجیں برلن تک پہونچ گئیں، اور سرخ فوجوں نے برلن پر امن کا جھنڈا لہرا دیا۔ اس لئے استالن گراد جو صدیوں سے جنگوں کا شہر تھا، ساری دنیا کے لئے امن کا نشان بن گیا، اور ساری دنیا نے اس کا اعتراف کیا جس کا ثبوت خود استالن گراد کے میوزیم میں موجود تھا۔ آخری کمرے میں مختلف ممالک کے تحفے رکھے تھے۔ خراج عقیدت چین سے لے کر امریکہ تک اور یورپ کے شمالی ممالک سے لے کر جنوبی تک اور آسٹریلیا تک دنیا کے ہر ملک اور ہر قوم نے پیش کیا تھا۔ سب سے زیادہ محبت بھرا تحفہ خود جرمنی کے امن پسندوں کا تھا، اور اسے دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ پوری جرمن قوم ہٹلری فاشزم کے ساتھ نہیں تھی۔ یہی احساس امریکہ کے تحفے دیکھ کر ہوا۔ پورا امریکہ جنگ کا حامی نہیں ہے۔

جب ہم شہر کے جنوبی حصے کی طرف جا رہے تھے تو راستے میں عجیب و غریب مناظر نظر آئے۔ یہ مناظر انسان کو جذباتی بنا دیتے ہیں۔

استالن گراد اپنے زخموں کو مندمل کر رہا ہے۔ اپنی تعمیر میں مصروف ہے۔ ہر ہر قدم پر نئی، خوب صورت اور سربلند عمارتیں سر اٹھا رہی ہیں، جیسے زمین سے درخت اگ رہے ہوں۔ یہ بوڑھا شہر تباہ و برباد ہونے کے بعد اپنے آپ کو سنوار رہا ہے، سجا رہا ہے۔ زلیخا پھر سے جوان ہو رہی ہے۔ رہنے کے مکانات، دوکانیں، دفتر، اسکول اور کالج کی عمارتیں، بچوں کے محل، پارک، باغات، مجسّمے، آرائشیں، سیدھی

www.taemeernews.com

دوڑتی ہوئی وسیع شاہراہوں کے لئے راستہ چھوڑ کر صف بہ صف کھڑی ہو رہی ہیں۔ جب آسمان کی طرف نظر اٹھتی ہے تو کرینوں کی لمبی گردنیں نظر آتی ہیں۔ بعض کرینیں اپنے لوہے کے دانتوں میں دیو پیکر پتھروں کو اور فولادی شہتیروں کو اٹھائے ہوئے ہیں۔ بعض کرینیں سیدھی کھڑی ہوئی آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ یکایک دو نئی عمارتوں کے بیچ میں کسی ٹوٹی ہوئی عمارت کا کھنڈر نظر آتا ہے جس کی دیواریں جل چکی ہیں۔ سر سے چھت کا سایہ اٹھ چکا ہے۔ ٹیڑھی میڑھی فولادی شہتیریں ٹوٹے ہوئے ہاتھ پاؤں کی طرح لٹک رہی ہیں۔ سیڑھیاں ٹوٹے ہوئے دانتوں کی طرح بکھری ہوئی ہیں۔ یہ کھنڈر جو انسانوں کی سجتی سنورتی بستی میں کھڑے ہوئے ہیں ہیبت ناک بھی ہیں اور عبرت ناک بھی۔ یہ جرمن سپاہ گروں اور فاشست جنگ بازوں کی وحشت اور بربریت کی زندہ یادگاریں ہیں۔ استالن گراد کے عزم و ہمت کے نشان ہیں۔ یہ کھنڈر زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں، ہم سے ڈرو اور ہم سے محبت کرو، ہم جنگ کا انجام بھی ہیں اور امن کا پیام بھی۔ ہم بے جان گھر تھے لیکن ہمارے سینے میں زندہ انسان رہتے تھے۔ بچوں کی کلکاریاں، ماؤں کی لوریاں، لباسوں کی سرسراہٹ، گیس کے چولھوں پر رکھی ہوئی پتیلیوں کی گنگنانے کی آواز، پیالوں کا نغمہ، نئی نئی محبت کی سرگوشیاں، گرم بوسوں کی آواز جیسے کلیاں چٹک رہی ہوں، کسی مایوس اور دل شکستہ لڑکی کی سسکیاں، ہماری دیواروں کی گودوں میں ایک دنیا بسی ہوئی تھی، ہماری کھڑکیوں میں چاند جھانکتا تھا، سورج مسکراتا تھا اور ستارے اپنے چنبیلی کے پھول برساتے تھے، ہم بے جان تھے مگر پھر بھی زندہ گھر تھے، یکایک ایک دن ہمارے سر پر لوہا برسنے لگا، کسی نے آگ کا سمندر انڈیل دیا اور آگ اور لوہے کے اس طوفان کے ساتھ جرمن نازی آئے۔ لیکن ہماری گود میں بسنے والے بوڑھے، بچے، جوان مرد و عورت سب سینہ تان کے کھڑے ہو گئے، ہم نے بھی ہمت نہیں ہاری، جرمنوں نے ہمیں جلانا چاہا، مٹانا چاہا، گرانا چاہا، لیکن ہمارے قدم اپنی جگہ سے نہیں ہلے۔ ہم آج بھی جلے ہوئے، مٹے ہوئے وہیں کھڑے ہیں جہاں پہلے

www.taemeernews.com

کھڑے تھے۔ ہم نے شکست نہیں مانی ہے۔ اور آج ہمارے گرد بہاریں مسکرا رہی ہیں۔ ہم قدیم مکان ہیں، بوڑھے اور ٹوٹے ہوئے، لیکن ہمارے آس پاس نئے مکان جوان ہوئے ہیں۔ نہ جانے کتنی نئی عمارتیں یہاں کھڑے ہونے کے لئے جگہ ڈھونڈ رہی ہیں۔ اب ہم ان کے لئے جگہ خالی کر دیں گے۔ جیسے مائیں اپنے بچوں کو پروان چڑھا کر قبروں میں چلی جاتی ہیں، بوڑھے جوانوں کے لئے راستہ چھوڑ دیتے ہیں۔ ہم بھی اب رخصت ہونے والے ہیں، بس ہم اتنا چاہتے ہیں کہ ہمارا ملبہ کسی نئی تعمیر میں کام آجائے، ہم مرجھائے ہوئے پھول ہیں۔ اب کھل نہیں سکتے۔ جنگ بازوں کی تخریبی کوششیں ہمیں نہیں ہٹا سکیں، لیکن نئی تعمیر کے جوان ہاتھ ہمیں پیار سے اٹھا کر ہماری قبروں میں سلا دیں گے اور ہر نئی تعمیر ہماری قبروں کا نشان ہوگی، اور آنے والے برسوں اور صدیوں میں جب مائیں اپنے بچوں کو استالن گراد کی کہانی سنائیں گی تو وہ یہ کہہ کر ہمارا ذکر ضرور کریں گی جہاں اب ہم رہتے ہیں یہاں پہلے جنگوں کے کھنڈر تھے۔

منظر بدلتا ہے۔ موٹر داہنی طرف مڑتی ہے۔ ریل کی پٹری کو پار کر کے بائیں طرف مڑتی ہے اور پھر ایک نیم دائرے کی شکل کی سڑک پر دوڑنے لگتی ہے، یہاں نہ کھنڈر ہیں نہ نئی سربلند عمارتیں۔ میلوں تک چھوٹے چھوٹے جھونپڑے پڑے ہوتے ہیں ان کے سامنے بچے کھیل رہے ہیں۔ لوگ ترکاریاں لئے چلے جا رہے ہیں، نوجوان لڑکے لڑکیاں بانہوں میں ہاتھ ڈالے ہوتے ہیں، یہ جھونپڑے کہاں سے آتے ہیں، ان میں کون لوگ رہتے ہیں، جواب ملتا ہے"۔ استالن گراد والے"۔ ابھی ان کے لئے مکان نہیں بن سکے ہیں۔ اس لئے انھوں نے اپنے جھونپڑے ڈال لئے ہیں۔ جب مکان بن جائیں گے تو یہ ان میں منتقل ہو جائیں گے، ان جھونپڑوں سے پہلے یہ ویران جنگی خندقوں اور بموں کے بنائے ہوئے گڑھوں میں رہ چکے ہیں۔ یہ استالن گراد والے ہیں۔ جنگ میں شہر کے تباہ ہو جانے کے بعد بھی انھوں نے اپنا شہر چھوڑنے سے انکار کیا۔ یہ ان کے لئے ایک جذباتی سوال بن گیا تھا، جس شہر کو تباہ و برباد ہونے کے بعد بھی انھوں نے جرمنوں سے

www.taemeernews.com

شکست نہیں کھانے دی۔ اس میں وہ جنگ کے بعد رہنا اپنے لئے فخر کی بات سمجھتے ہیں۔ یہ جھونپڑے انھوں نے اپنے ہاتھوں سے بناتے ہیں اور اب ان میں رہ کر اپنے انھیں ہاتھوں سے نئی تعمیر کے محل بنا رہے ہیں۔ جنھوں نے اسٹالن گراد کی حفاظت کی تھی وہی اس کی تعمیر بھی کر رہے ہیں اور جب تک تعمیر ہو اس وقت تک جھونپڑوں میں رہنا فخر اور عزت کی بات ہے۔ یہ آن پر جان دینے والے ایک اچھے گھر کے لئے اپنے محبوب شہر کو نہیں چھوڑ سکتے۔

اب ہم شہر کے بالکل جنوبی حصّے پر پہونچ گئے تھے۔ جہاں والگا سے وہ نہر نکلی ہے جو ڈان سے جاکر مل جاتی ہے۔ یہاں والگا بل کھا کے مڑ جاتا ہے۔ اور جہاں اس کی کمر کا خم ہے وہاں سے نہر نکالی گئی ہے جو ایک عظیم الشان محراب کے نیچے سے بہتی ہے۔ اور ایک پل کے نیچے سے نکل کر افق کی طرف چلی جاتی ہے اوپر سے سفید بادل گذر رہے ہیں اور نیچے ساحل کی ریت پھیلی ہوئی ہے۔ ڈھالوں پر سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ اور پھول لگے ہیں۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں دریا اور نہر میں تیر رہے ہیں بہت سے لوگ ریت پر دھوپ کھا رہے ہیں، مائیں اپنے بچوں کو لے کر آئی ہیں اور بہت سے نوجوان اپنی خوب صورت معشوقاؤں کے ساتھ عہد و پیمان کر رہے ہیں۔ دریا میں ایک جہاز تیرتا ہوا آتا ہے اور نہر کے دہانے میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہ جہاز نہر کے راستے سے راسٹوف جا رہا ہے۔ یہ میپین کی بنائی ہوئی تصویر سے کتنا مختلف ہے، جہاز میں تاجر اور زار کے عہد کے فوجی افسر نہیں ہیں بلکہ مزدور ہیں۔ دانشور ہیں، نوعمر طالب علم ہیں، جو چھٹیاں منانے اور تفریح کرنے جا رہے ہیں۔ ساحل پر انسانوں کی شکل کے جانور نہیں ہیں جن کی گردنوں میں رسیاں بندھی ہوں اور جو جہاز کو کھینچ رہے ہوں۔ ساحل اپنے خوش و خرم انسانی ہجوم کے ساتھ مسکرا رہا ہے۔ ایک ادھیڑ عمر کا سپاہی ڈھال پر بیٹھا ہوا باجا بجا رہا ہے، اور اس کے گرد کھڑے ہوئے بہت سے لڑکے اور لڑکیاں گا رہے ہیں تالیاں بجا رہے ہیں۔ اس آواز کو سن کر میرے کانوں میں والگا کے ملاحوں

www.taemeernews.com

کا دل ہلا دینے والا نغمہ گونج جاتا ہے۔ گورکی کی کتنی ہی کہانیاں اور بیانات یاد آجاتے ہیں یہ منظر ان سے بالکل مختلف ہے۔ اس منظر میں مسرت ہے۔ اطمینان ہے، خود اعتمادی ہے، محبت ہے، گرم جوشی ہے۔ میری نظروں میں جنیوا کی جھیل کے کنارے کے مناظر گھوم جاتے ہیں۔ بمبئی کا میرین ڈرائیو یاد آجاتا ہے۔ لکھنؤ میں گومتی کا کنارہ اور الہ آباد میں گنگا جمنا کا سنگم یاد آجاتا ہے۔ اور میں سوچنے لگتا ہوں یہ مختلف نظاموں کے مناظر ہیں اور پھر بھی کتنے یکساں ہیں۔ یہاں کے لوگ سرمایہ داری سے نفرت کرتے ہیں وہاں کے بہت سے لوگ کمیونزم اور سوشلزم کے نام سے گھبراتے ہیں، لیکن ہنستے ایک طرح ہیں، پیار ایک طرح سے کرتے ہیں، امریکہ میں نے نہیں دیکھا ہے۔ لیکن یہی سب کچھ وہاں بھی ہوتا ہے، پھر اپنے دریاؤں اور سمندروں کے ساحلوں پر تفریح کرنے والے دوسرے دریاؤں اور سمندروں کے ساحلوں پر تفریح کرنے والوں پر بمباری کا خیال دل میں کیسے لا سکتے ہیں۔ کیا ایٹم بم انسانی پیار اور انسانی جذبے کا خاتمہ نہیں ہے؟

میں اپنی اجنبیت سے فائدہ اٹھا کر ایک ماں کے پاس چلا جاتا ہوں جو اپنے بچوں کو پیار کر رہی ہے اور میں اس سے ایک بڑا مہمل سوال کرتا ہوں، اس کا جواب جانتے ہوئے بھی میں اس سے سوال کرتا ہوں۔

"تم جنگ کیوں نہیں چاہتیں؟"

وہ میری طرف حیرت سے دیکھتی ہے، جیسے میں پاگل ہوں، پھر پوچھتی ہے "تمہارے بچے ہیں؟"

"ہاں۔"

"انھیں میری طرف سے پیار کرنا۔"

۳۱ جولائی ۱۹۵۵ء میں استالن ٹریکٹر فیکٹری میں تھا، یہ شہر کے شمال میں ہے اور یہاں لڑائی کے زمانے میں جرمنوں کے خلاف بہت بڑا مورچہ قائم تھا، یہ فیکٹری بھی استالن گراد والوں کی ہمت اور شجاعت کا نشان ہے۔ اس کے چاروں طرف لڑائی

www.taemeernews.com

ہوتی رہی اور لڑنے والوں میں خود فیکٹری کے مزدور تھے۔ مرد اور عورتیں۔ فیکٹری پر نازی بمباری کرتے رہے اور آسمان پر برف باری۔ مگر ٹوٹی ہوئی چھتوں کے بم اور برف کے طوفان میں یہاں کے انقلابی مزدور اپنی مشینوں کو چلاتے رہے۔ پندرہ بیس دن کے اندر اندر انھوں نے ٹریکٹر کی فیکٹری کو ٹینک کی فیکٹری بنا دیا تھا۔ فیکٹری اپنے مزدوروں کی طرح قدم جمائے کھڑی رہی اور ایک دن کے لئے بھی بند نہ ہوئی۔ یہ بات جرمنوں کا دل اور ان کی ہمت توڑ دینے کے لئے کافی تھی۔

مزدوروں نے بڑی محبت سے اپنا کارخانہ مجھے دکھایا، اور مختلف اسٹیجوں سے گذرنے کے بعد میں وہاں پہونچ گیا، جہاں ٹریکٹر مکمل ہوکر باہر نکلتے ہیں۔ ان کی گڑگڑاہٹ ٹینکوں کی سی ہے، لیکن یہ آگ لگانے کے بجائے سونا اگاتے ہیں۔ فیکٹری کی دیواروں پر اور باہر کے احاطے میں مزدوروں کے عہد نامے لگے ہوئے تھے۔ اچھے مزدوروں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ اور کھیتوں کی پیداوار کے نقشے ٹنگے ہوئے تھے۔ ایک طرف کتابوں کی ایک چھوٹی سی دوکان تھی، میز پر کتابیں سجی ہوئی تھیں اور کھلے آسمان کے نیچے ایک بوڑھی عورت بیٹھی ہوئی تھی، مزدور آتے جاتے وہاں سے کتابیں خریدتے رہتے تھے۔ ان کتابوں میں سویت کے مشہور اور مقبول ناول اور افسانے تھے، شاعری تھی، سائنس کے متعلق کتابیں تھیں۔ مارکس، اینگلز، لینن اور اسٹالن کی تصنیفات تھیں اور بیرونی ممالک کے مشہور ادیبوں کی کتابیں تھیں۔ میں انھیں الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا، اور اس عورت سے پوچھ رہا تھا کہ روزانہ کتنی کتابیں بک جاتی ہیں کہ ایک مزدور عورت آئی۔ اس کی عمر کوئی چالیس پینتالیس برس کی ہوگی اور اس نے کوئی ساٹھ کتابوں کی فہرست دوکاندار کو یہ کہہ کر دی کہ "میں چھٹی پر جا رہی ہوں، میرا پتہ کاغذ پر لکھا ہے، میرے لئے یہ کتابیں مہیا کر دینا"۔ جب میں نے اس فہرست کا جائزہ لیا، تو اس میں موجودہ دور کی سویت کتابوں کے علاوہ ٹالسٹائی، داستوفسکی، ٹیگور، کالی داس، برنارڈ شا اور رومین رولاں کی تصانیف کا نام بھی لکھے ہوئے تھے، یہ واقعہ سویت مزدوروں

www.taemeernews.com

کی تہذیبی سطح کو سمجھنے کے لئے کافی تھا۔

اس کی مزید تصدیق اس وقت ہوئی جب میں دریا کے کنارے مزدوروں کے تہذیبی محل میں پہونچا، دو منزلہ خوب صورت عمارت تھی، جس میں ایک بہت حسین تھیٹر کے علاوہ ناچ کے کمرے، موسیقی کے کمرے، مصوری کے کمرے، اور عام جلسے کے کمرے تھے، اور ایک کتب خانہ تھا، جس میں کئی ہزار کتابیں تھیں جو مزدور میرے ساتھ تھے، میں نے ان سے ادب پر باتیں شروع کر دیں۔ ان کی سطح اچھی خاصی تھی، یکایک میں نے میز سے ایک کتاب اٹھا کر اس کا نام پوچھا۔ یہ کرشن چندر کے افسانوں کا مجموعہ تھا، جو حال ہی میں شائع ہوا تھا، کئی مزدوروں نے ایک ساتھ کرشن کے افسانوں کی تعریف شروع کر دی۔ مجھے تھوڑی سی شرارت سوجھی، میں نے پوچھا "تمھیں کون سا افسانہ سب سے زیادہ پسند ہے"۔

"میں انتظار کروں گا" ایک مزدور نے جواب دیا۔

"وہ تمہیں شاید سیاست کی وجہ سے پسند ہے" میں نے کہا "کیوں کہ اس میں چین اور کوریا کا ذکر ہے"۔

"مگر اس میں جو انسانیت اور محبت ہے"۔ مزدور نے احتجاج کیا۔

"میں کرشن کے خلاف بولنے لگا" کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ کرشن رومانی ہے"۔

"اسی لئے تو وہ ہمیں پسند ہے"۔ کئی مزدوروں نے ایک ساتھ کہا۔

"مگر میرا خیال ہے کہ وہ اپنے رومانی رویئے کی وجہ سے حقیقت کو مسخ کر دیتا ہے اس لئے حقیقت نگاری کے معیار پر پورا نہیں اترتا"۔

وہ سب میری باتیں سن کر کچھ چپ سے ہو گئے، معلوم نہیں وہ قائل ہو گئے تھے۔ یا مہمان کا احترام کر رہے تھے، پھر ایک مزدور بولا "میرا خیال نہیں ہے۔ رومانیت کی آمیزش کے بغیر اچھی حقیقت نگاری ممکن نہیں ہے"۔ میں نے محسوس کیا یہ گورکی کی تربیت کا اثر ہے۔ یہ محسوس کرتے ہوئے میں نے اپنی بات آگے بڑھائی۔

www.taemeernews.com

"پھول سرخ ہیں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے"؟ میں نے پوچھا" کیا اس میں کرشن نے مزدوروں کی حقیقی زندگی کو مسخ نہیں کر دیا ہے"؟

"حقیقت سے مراد اگر جسمانی تصویر ہے تو وہ شاید مسخ ہو گئی ہو۔ ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے، لیکن جہاں تک مزدوروں کے انقلابی جذبے کا تعلق ہے، وہ اس کہانی میں بڑی شدت کے ساتھ موجود ہے، اسی لئے وہ مجھے پسند ہے۔"

ایک دوسرا مزدور بولا کہ "کالو بھنگی اور ان داتا بھی ایسے ہی افسانے ہیں"۔

لیکن قبل اس کے میں کچھ کہتا ایک اور مزدور نے مجھ سے ایک سوال کر لیا" آپ کرشن چندر کے اتنے مخالف کیوں ہیں"؟

میں ہنسنے لگا" کرشن چندر کے افسانے مجھے بھی بہت پسند ہیں۔ میں صرف آپ لوگوں کی رائے معلوم کرنا چاہتا تھا اور اعتراضات کر رہا تھا، جو بعض لوگ کرشن کی افسانہ نگاری پر کرتے ہیں"۔

میں کچھ اور کہتا لیکن میری بات ایک مزدور لڑکی نے یہ کہہ کر کاٹ دی" پورے چاند کی رات بہت خوب صورت افسانہ ہے، اس میں ہندوستان کا حسن ہے، اور صرف ایسا افسانہ نگار لکھ سکتا ہے جو زندگی سے بے انتہا محبت کرتا ہو"۔

وہاں سے میں ایک مزدور کے گھر پہونچا، مکان کا انتخاب میں نے خود کیا تھا، ہم نے دروازہ کھٹکھٹایا، ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے دروازہ کھولا، وہ ننگے پیر تھی اور ہاتھ میں ایک کتاب لئے ہوئے تھی، اس نے مجھے دیکھ کر بڑی خوشی کا اظہار کیا کیوں کہ میں پہلا ہندوستانی تھا جو اس کے گھر آیا تھا، گھر میں غسل خانے کے علاوہ دو کمرے اور ایک باورچی خانہ تھا، سونے کے کمرے میں پلنگوں پر بڑے اچھے پلنگ پوش پڑے تھے، بیٹھنے کے کمرے میں معمولی درجے کا صوفہ سٹ تھا، برچ کی میزیں تھیں مگر کتابوں کی الماریاں اعلیٰ درجے کی تھیں، انھیں کے بیچ میں ٹیلی ویژن کا سٹ بھی رکھا ہوا تھا، باورچی خانہ میں گیس کے چولھے کے پاس ایک میز اور چند کرسیاں بھی پڑی ہوئی تھیں، اس نے مجھے یہ کہہ کر میز پر بٹھا دیا کہ

www.taemeernews.com

"معلوم ہوتا کہ مہمان آنے والے ہیں تو کچھ اچھا کھانا پکا لیتی۔ اب تو جو کچھ گھر میں ہے وہی چکھ لو۔" کھانے میں بڑی پہاڑی مرچیں تھیں، جن میں قیمہ بھرا ہوا تھا، اور انھیں چاول اور ٹماٹر کے ساتھ ملا کر پکا دیا گیا تھا۔ پینے کے لئے میٹھا رس تھا، جس میں بھُنے ہوئے یا ابلے ہوئے سیب کے ٹکڑے پڑے تھے۔

میں نے سب سے پہلے اس کا نام پوچھا۔

"مارگریٹا پاولووا"

"تم کیا کرتی ہو" کے جواب میں اس نے ہنس کر کہا "کچھ نہیں"۔ "لڑکیوں کی شادی ہو گئی ہے اور میرا شوہر ٹریکٹر فیکٹری میں کام کرتا ہے۔ مجھے بس کتابیں پڑھنے کا شوق ہے"۔

میز پر وہ کتاب رکھی تھی جو ابھی دروازہ کھولتے وقت اس کے ہاتھ میں تھی میں نے پوچھ لیا، "یہ کون سی کتاب ہے"۔

"مائیکل انجلو اور ون کے حالات زندگی۔ رومین رولاں کی کتاب ہے، تم نے بھی پڑھی ہو گی"۔

اس نے کتاب میرے سامنے بڑھا دی۔ "تم پہلے ہندوستانی ہو جس سے میں ملی ہوں، اور شاعر بھی ہو۔ اس کتاب پر کچھ لکھ دو"۔

میں نے اس پر لکھا۔ "میں نے استالن گراد دیکھا ہے، یہ مائیکل انجلو کے بنائے ہوئے داود کے مجسمے کی طرح طاقتور ہے اور بیتھوون کے نغموں کی طرح حسین۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ استالن گراد کا حسن روز بروز بڑھ رہا ہے"۔

مارگریٹا نے مجھے رخصت کرتے ہوئے کہا۔ "میں اس کتاب کو ہمیشہ اپنے پاس رکھوں گی دس برس بعد آکر استالن گراد کو دیکھنا، تم اسے پہچان نہیں پاؤ گے، جس گھر میں میں رہ رہی ہوں پہلے کھنڈر تھا"۔

میں اس گھر سے باہر نکلا تھا کہ دوسری منزل سے ایک آواز آئی، مڑ کر دیکھا ایک

www.taemeernews.com

خوب صورت لڑکی بالکونی میں کھڑی ہوئی اپنے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی اور میری مترجم روسی زبان میں کچھ کہہ رہی تھی، اوکسانا نے مجھے بتایا کہ وہ مجھے اپنے گھر میں بلا رہی ہے۔

میں دوسری منزل پر گیا۔ گالا دروازہ کھولے ہوئے میرا انتظار کر رہی تھی، میں نے اسے قریب سے دیکھ کر محسوس کیا کہ اتنی حسین لڑکی شاید لاکھوں میں ایک ہوتی ہوگی اور اس کا اظہار بھی میں نے کر دیا۔ "تم بے حد خوب صورت ہو، تمہاری عمر کیا ہے، کوئی چودہ پندرہ برس۔"

"سولہ برس"۔ گالا نے جواب دیا۔ "میں اسکول میں پڑھتی ہوں، تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ ہندوستانی بہت اچھے ہوتے ہیں۔"

"کیوں"؟ میں نے پوچھا۔

"وہ امن کے حامی اور جنگ کے دشمن ہیں، میں نے پنڈت نہرو کو ٹیلی ویژن پر دیکھا ہے اور ٹیگور کی کہانیاں پڑھی ہیں۔ پھر۔ ابھی آتی ہوں۔" کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں دوڑ گئی اور ریڈیو گرام پر گانے کا ریکارڈ لگا کر واپس آگئی۔

میں نے پوچھا۔ "گالا تم اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد کیا کرنا چاہتی ہو۔"

میں استانی بننا چاہتی ہوں۔ مجھے پڑھانے کا بڑا شوق ہے۔"

"کیا پڑھانا چاہتی ہو۔"

"یہ تو میں نے ابھی نہیں سوچا، اپنی ثانوی تعلیم ختم کرنے کے بعد سوچوں گی۔"

"مگر تم کچھ نہ کچھ تو ضرور سوچتی ہوگی۔ کبھی کبھی خواب بھی دیکھتی ہوگی، سوتے اور جاگتے ہوئے۔"

"سوچتی کیوں نہیں ہوں۔ میں اپنے خوابوں کو اپنی ڈائری میں لکھ لیتی ہوں۔" یہ کہتے کہتے گالا شرما گئی۔

وہ انگریزی میں باتیں کر رہی تھی، اس لئے مجھے مترجم کی ضرورت نہیں تھی، میں نے پوچھا۔ "تم نے سب سے خوب صورت خواب کیا دیکھا ہے۔"

"امن" اور اس کا چہرہ پھر گلابی ہوگیا۔

www.taemeernews.com

"امن کو تم نے خواب میں کیسے دیکھ لیا" مجھے واقعی حیرت تھی۔

گالا نے کہا" مجھے گانے کا بہت شوق ہے۔ ایک رات میں نے یہ خواب دیکھا کہ بہت بڑا کھیت ہے اور اس میں بہت سارے ٹریکٹر چل رہے ہیں اور ان کے پہیوں سے جو آواز نکل رہی ہے اور بیتھوون کا ایک نغمہ ہے"

"ان ٹریکٹروں کو چلا کون رہا تھا" میں نے شرارت سے پوچھا۔

اس سوال کا جواب صرف اس کے رخساروں پر جھلک آنے والے خون نے دیا۔ یہ لڑکی ضرور کسی لڑکے سے محبت کرتی ہوگی اور مجھے یقین ہے کہ اسے ہر ٹریکٹر میں وہی لڑکا بیٹھا ہوا نظر آیا ہوگا۔ یہ کتنی خوب صورت بات ہے کہ سویت کی نئی جوانی ٹریکٹر بیتھوون کے نغمے اور ان کے خوابوں سے بنی ہے۔

گالا ٹریکٹر فیکٹری کے ایک مزدور کی بیٹی تھی، جب میں اس کے گھر سے باہر نکل رہا تھا، تو اس کا باپ کارخانے سے واپس آگیا، میں نے اس سے کہا کہ" اگر میں ہندوستان کی پرانی زبان میں بات کروں تو یہ کہوں گا کہ تم نے اتنی خوب صورت بیٹی پیدا کی ہے، تو کتنے خوب ٹریکٹر بناتے ہوگے۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور گالا نے اپنی بالکونی سے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا" دسوی دانیا۔ (پھر ملیں گے)

ہوٹل میں واپس آتے آتے شام ہوگئی اور ایک گھنٹے بعد مجھے پلینی ٹیریم دیکھنے جانا تھا، اس لفظ کا ترجمہ میں اپنی آسانی کے لئے انجستان کئے لیتا ہوں، مولوی عبدالحق نے اپنی لغت میں اس کا ترجمہ کیا ہے" نظام سیارات کا نمونہ" یعنی ایک ایسا گھر جس میں سیاروں کا نظام دیکھا جاتا ہو یا پڑھایا جاتا ہو۔ اس لئے میرے نزدیک انجستان کے لفظ سے کام چل سکتا ہے۔ ہندوستان میں کوئی ایسی عمارت نہیں ہے، استالن گراد کو یہ مشرقی جرمنی کی حکومت کا تحفہ ہے، اب اس میں سویت والوں نے کچھ اضافے کر لئے ہیں۔

انجستان ایک گنبد دار عمارت ہے۔ اس کے ڈائرکٹر نے میرا استقبال کیا، اور

www.taemeernews.com

مجھے بتایا کہ "بس ابھی زمین کے زلزلوں اور آتش فشاں کے بارے میں ایک لکچر ہونے والا ہے، کیا آپ اس میں شریک ہونا پسند کریں گے"۔ لکچر شروع ہونے میں ابھی آدھا گھنٹہ تھا۔ اس لئے مجھے ڈائرکٹر دیواروں پر بنے ہوئے نقشے اور تصویریں دکھانے لگا۔ وہاں اور بھی بہت سے عورت مرد موجود تھے۔ وہ بھی ڈائرکٹر کی تشریحات سننے کے لئے جمع ہو گئے۔ اسی ہجوم میں گالا بھی تھی جو آج کا لکچر سننے آئی تھی۔

پہلی تصویر چاند کے پہاڑوں اور غاروں کی تھی۔ وہاں ہمیشہ دن رہتا ہے اور چونکہ چاند کے گرد زمین کی طرح فضا نہیں ہے، اس لئے وہاں سے دن کو بھی ستارے نظر آتے ہیں۔ دوسری تصویر مریخ کی تھی جو بیج بسنہ ہے لیکن اس کے باوجود وہاں نباتات کا امکان پایا جاتا ہے اور بعض سویت سائنس داں اس کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ پھر اور تصویریں اور نقشے تھے۔ دوسری دنیائیں اور کائناتیں تھیں جن تک انسان کا تخیل بھی مشکل ہی سے سفر پاتا ہے، ان کائناتوں میں نظامِ شمسی سے مختلف نظام تھے اور ہمارے سورج سے ہزاروں اور لاکھوں گنا بڑے سورج تھے۔ بعض ستارے اتنے بڑے تھے کہ ان میں سرنگ بنا کر ریل پر سفر کیا جائے تو ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہونچنے میں لاکھوں برس لگ جائیں گے کائنات کی اس وسعت میں زمین کا سیارہ ہزاروں لاکھوں میل لمبی چوڑی مخمل پر پڑی ہوئی ایک ہیرے کی کنی کے برابر ہے، اور اس زمین پر انسان۔ لیکن اس کے ذہن کی طاقت اس کائنات کا احاطہ کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

ڈائرکٹر نے بتایا کہ "اب چاند تک پہونچنا آسان ہو گیا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب کہ ماہرینِ سائنس چاند کا سفر کریں گے۔"

گالا اس طرح مسکرا رہی تھی جیسے وہی سب سے پہلے چاند پر جائے گی، مجھے ایک دم سے خیال آیا کہ بینڈونگ کانفرنس کے وقت جب ہندوستانی جہاز کو کومنٹانگ کے ایجنٹوں نے بم رکھ کر سمندر میں گرا دیا تھا اس کے ایک ہوا باز نے اپنی معشوقہ سے روم میں ملنے کا وعدہ کیا تھا اور گالا اپنے دوست کو چاند پر ملنے کے لئے بلا سکتی ہے۔

www.taemeernews.com

کیا انسان کبھی چاند پر آباد ہو سکے گا۔ وہاں فضا نہیں ہے، وہاں رات نہیں ہوتی۔ بڑی غیر رومانی جگہ ہوگی، پھر یہ ماہرین سائنس چاند پر کیوں جانا چاہتے ہیں، اور میں نے یہ کیوں سوچا کہ گالا اپنے دوست سے اقرار محبت کرنے کے لئے چاند پر جا سکتی ہے۔ اگر وہاں فضا نہیں ہے اور رات نہیں ہوتی تو یہ نتیجہ کیسے نکالا جا سکتا ہے کہ چاند غیر رومانی جگہ ہے، ممکن ہے اس کی رومانی کیفیت کچھ اور ہو۔ زمین سے زیادہ دلچسپ۔ آخر چاند یہاں سے کتنا حسین اور دلنواز معلوم ہوتا ہے۔ میرے خیالات بڑی تیز رفتاری سے دوڑ رہے تھے، یکایک مجھے ایک مضمون یاد آ گیا جو میں نے بہت دن ہوئے کسی امریکی باتصویر رسالے میں پڑھا تھا رسالے کا نام انتہائی کوشش کے بعد بھی یاد نہیں آیا، اس مضمون میں بھی چاند کے سفر پر قیاس آرائیاں تھیں اور یہ سوال تھا کہ آخر آدمی چاند پر کیوں جانا چاہتا ہے۔ مصنف نے لکھا تھا کہ پہلے ایک راکٹ زمین کی فضا سے باہر پھینک دیا جائے گا اور وہ زمین اور چاند کی درمیانی وسعت میں معلق ہو جائے گا، وہاں سے زمین کا ہر حصہ دیکھا جا سکے گا اور جنگ چھیڑ جانے کی صورت میں اس کرہ سے زمین کے کسی بھی حصے پر بم باری کی جا سکے گی اور اس کرہ کو فضائی جہازوں کے اڈے کی طرح بھی استعمال کیا جا سکے گا۔ گویا چاند کے سفر کے دوران میں بیچ میں آدمی کہیں ٹھیر بھی سکے گا۔ یہ کتنا حسین شیطانی خیال ہے۔ مرتا ہوا سرمایہ داری نظام پورے کرۂ ارض پر بم باری کرنا چاہتا ہے۔ میں گالا کو اس کے سارے حسن کے ساتھ چاند ستاروں کی وسعت میں بھیجنا چاہتا ہوں، اور جنگ باز اپنے فضائی بم باروں کو ستاروں کی دنیا میں زہر پھیلانے کے لئے۔ اور کرۂ ارض کو پاش پاش کرنے کے لئے۔ یہ کیسی شیطنت ہے، کیا سویت والے بھی یہی سوچ رہے ہیں، فضا میں ایک کرہ امریکہ معلق کرے گا، دوسرا شاید برطانیہ، تیسرا فرانس، چوتھا سویت یونین۔ کیا جنگ کا تصور انسان کو اتنا دیوانہ کر سکتا ہے۔ آخر میں نے گھبرا کر انجمستان کے ڈائرکٹر سے یہ سوال پوچھ ہی لیا کہ "آپ چاند پر کیوں جانا چاہتے ہیں"۔

ڈائرکٹر نے جواب دیا: "میں نے ابھی بتایا تھا کہ چاند کے گرد فضا نہیں ہے اور دن کو

www.taemeernews.com

بھی ستارے دکھائی دیتے ہیں۔ انسان نے اب تک سیاروں کا مطالعہ زمین سے کیا ہے زمین سے بہت سے ستارے اور سیارے صاف دکھائی نہیں دیتے اور بہت سے ایسے نظام بھی ہیں جو بالکل نہیں دیکھے جا سکتے۔ چاند سے زیادہ آسانی کے ساتھ ستاروں کے نظام کو دیکھا اور سمجھ سکتا ہے۔ اور یہ آپ کو معلوم ہوگا کہ انسان نے ستاروں کے نظام کو سمجھ کر دنیا کے مسائل حل کئے ہیں۔ وہاں سے چاند پر سورج کی ریڈیائی طاقت کا بھی بہتر مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔"

"کیا وسعت کائنات کا تصور آپ کو پریشان نہیں کرتا۔"

"انسان کا ذہن اس سے بھی زیادہ وسیع ہے۔ اس کی رسائی کی کوئی انتہا نہیں، پھر وہ مجھے دیر تک یہ سمجھاتے رہے کہ اب تک جتنے ستاروں کا شمار کیا گیا ہے اور جتنے فضائی اور سماواتی مسائل حل کئے گئے ہیں وہ کسی تنہا انسان کے بس کا کام نہیں، محض ستاروں کو گننے کے لئے کروڑوں برس کی عمر چاہیئے۔ یہ ساری کوششیں ساری دنیا اور تمام عہدوں اور زمانوں کے انسانوں کو ایک برادری میں اور انسانی برادری کو ایک انسانی ذہن میں تبدیل کر دیتی ہیں اور وحدت انسان کا وہ تصور پیدا ہوتا ہے، جو امنِ عالم کا ضامن ہے۔"

اب لکچر کا وقت آگیا تھا اور ہم گول گنبد کے اندر پہونچ گئے۔ گنبد بہت بڑا تھا اور اس کی چھت آسمان کا برج معلوم ہوتی تھی اور جہاں گنبد کے نچلے سرے افق کی طرح دیواروں سے ملتے تھے وہاں استالن گراد کا شہر تصویروں کے ذریعے سے بنا دیا گیا تھا۔ اس گنبد میں سمتوں کا تعین تھا، ہم اتر کے سرے پر بیٹھے تھے، ہمارے بائیں طرف پورب تھا، اور داہنی طرف پچھم اور سامنے دکھن۔ گنبد کے نیچے کے ہال میں کرسیاں پڑی تھیں۔ اور بیچوں بیچ میں ایک دیو ہیکل سیاہ مشین کھڑی ہوتی تھی، جس کے اندر جرمن سائنس دانوں نے سیاروں کا نظام بند کر رکھا تھا۔

روشنی گل ہوگئی اور گنبد کے اندر گہرا اور گھنا اندھیرا چھا گیا، واقعی ہاتھ کو ہاتھ

www.taemeernews.com

نہیں سُجھائی دیتا تھا۔ اور اس اندھیرے میں ایک عورت کی آواز تیرتی ہوئی آئی، زمین کے زلزلوں اور آتش فشاں پر لکچر شروع ہوگیا تھا اور گنبد پر زمین کی تہوں کی تصویریں متحرک تھیں۔ لکچر کے خاتمے کے بعد گنبد کے آسمان پر نظام شمسی نمودار ہوا۔ سورج تھا، چاند تھا، مریخ، زہرہ، عطارد۔ اور انھیں کے ہجوم میں کرۂ زمین تھا، ان کے فاصلوں کا تناسب وہی تھا جو آسمان پر ہے اور ان کی گردشیں اپنے سیاروں اور چاندوں کے ساتھ ساتھ اسی رفتار کے تناسب سے تھیں جو نظام شمسی میں پایا جاتا ہے۔ اس نظام کو سمجھانے کے بعد اندھیرے سے آنے والی آواز نے کہا کہ اس مشین کے ذریعے سے آسمان کا ہر حصہ دکھایا جا سکتا ہے۔ اس وقت استالن گراد کا آسمان دکھایا جائے گا، گہرا اور گھنا اندھیرا پھر چھا گیا اور آسمان پر ستارے چٹکنے لگے۔ چاند نکلنے لگا، اور پورا آسمان ستاروں سے بھر گیا اور یہ سب اپنے اپنے فاصلوں اور رفتاروں کے تناسب سے گردش کر رہے تھے، یہی نہیں بلکہ ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گر بھی رہے تھے، کوئی ستارہ کم روشن تھا اور کوئی زیادہ۔ ان کی رنگتیں بھی ویسی ہی تھیں جیسے اصلی آسمان پر ہوتی ہیں۔ رات بھر میں ستارے جو سفر کرتے ہیں وہ پورا ہوگیا اور پھر ایک ایک کر کے ستارے بجھنے لگے، افق پر نور کی سفیدی پھیلنے لگی، چاند کا رنگ پھیکا پڑنے لگا، شفق کی پھیلتی ہوئی لالی نے چاند کو اور پھیکا کر دیا، اور صبح کا سہانا نور پورے گنبد پر چھا گیا۔ افق پر شفق کی لالی میں سے سورج کی کرنیں پھوٹنے لگیں اور پھر سورج کی سرخ اور سنہری پیشانی ابھری اور آہستہ آہستہ پورا سورج باہر نکل آیا، ہال روشن ہوگیا اور ستاروں میں تیرنے والی آواز گم ہوگئی، چاند غائب ہوگیا، اور گالا کا خوب صورت چہرہ مسکراتا رہا۔

یہ خواب تھا یا جادو۔ سائنس کا کرشمہ تھا یا آرٹ کا۔ فطرت کتنی حسین ہے اور اپنے حسن کے لٹانے میں کتنی فیاض۔ لیکن انسان فطرت کے حسن میں اضافہ کرنے میں کمال رکھتا ہے، اصلی آسمان بھی اتنا حسین نہیں ہے جتنا انجستان کے گنبد میں بند آسمان ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے کوئی بہت اچھی نظم پڑھی ہے، کوئی بہت گمبھیر اور خوب صورت نغمہ

www.taemeernews.com

سنا ہے۔ پہلی اگست سے۔

اب میرا سفر ختم ہو رہا تھا۔ تیسرے دن کی صبح ہو گئی تھی اور میں استالن گراد کے معمار کے کمرے میں تھا۔ دو بڑی میزوں پر مستقبل کا پورا استالن گراد پھیلا ہوا تھا۔ چھوٹے چھوٹے کھلونوں کی طرح کی عمارتیں غالباً پلاسٹک سے بنائی گئی تھیں۔ سڑکیں، دریا، پل باغات، اور پارک۔ ایک قابلِ فخر اور سربلند شہر۔ لیسات معلوم نہیں کہانی کہہ رہا تھا یا نظم سنا رہا تھا یا خواب دیکھ رہا تھا۔

استالن گراد کے نئے شہر کی تعمیر کے لئے تین مشکلوں پر قابو پانا ضروری ہے۔ پہلی مشکل تو یہ ہے کہ استالن گراد شہر بہت لمبا ہے۔ شہر تین صدی پہلے تجارت اور دفاع کی غرض سے بنایا گیا تھا مگر بغیر کسی منصوبے کے۔ اس لئے یہ جنگلی درختوں کی طرح اگتا رہا، اور بڑھتا اور پھیلتا رہا۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک پچاس ساٹھ میل کا فاصلہ ہے، یہ دیکھئے یہ شہر کا شمال ہے۔ جہاں استالن ٹریکٹر فیکٹری ہے۔ جس کے پاس پن بجلی کے لئے پل باندھا جا رہا ہے اور یہ شہر کا جنوب ہے جہاں سے والگا کی نہر نکلی ہے۔ اگر کوئی لڑکا والگا کی نہر کے کنارے رہتا ہو اور ٹریکٹر فیکٹری کی کسی لڑکی سے محبت کرتا ہو تو اسے ملاقات کے لئے تار دینا پڑے گا اور لڑکی کو گھنٹوں انتظار کرنا پڑے گا، اس لئے نئے شہر کی تعمیر کے وقت خاص طور سے ذرائع آمد و رفت کا خیال رکھنا پڑے گا۔ اس لئے شمال سے جنوب تک تین متوازی سڑکیں بنائی جائیں گی۔ ایک سڑک تیز رفتار گاڑیوں کے لئے ہو گی بیچ کی سڑک سب سے خوب صورت اور وسیع ہو گی۔ یہ آدھی بن چکی ہے، اور اس کا نام شاہراہ استالن ہے۔ دوسری مشکل موسم سے تعلق رکھتی ہے۔ استالن گراد گھاس کے وسیع میدانوں کے کنارے پر ہے جسے اسٹیپ کہتے ہیں۔ یہاں قراقم کے ریگستان کی خشک اور گرم ہوائیں آتی ہیں اور زمین کی ساری رطوبت کھینچ لے جاتی ہیں، اس لئے یہاں پھول اور اونچے درخت نہیں اُگتے، اس لئے استالن گراد کو سرسبز و شاداب باغوں کا شہر بنانا ہے۔ آپ نے دریا کے کنارے کا پارک دیکھا ہو گا۔ ایک یورپ کی خاتون نے کہا تھا کہ دریا کے کنارے کی

www.taemeernews.com

سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے اور پارک سے گذرتے ہوئے روم اور یونان کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ایسے پارکوں اور باغوں اور درختوں کے لئے ہمیں بہت سے انتظامات کرتے ہیں۔ تیسری مشکل طبقات الارض سے تعلق رکھتی ہے۔ استالن گراد کی زمین عمارت اچھی نہیں ہے اس میں بڑے بڑے گڑھے ہیں۔ بعض گڑھے پٹ گئے ہیں لیکن اندر سے کھوکھلے یا کمزور ہیں۔ اس لئے اگر ان پر عمارت بنا دی جائے تو وہ اندر دھنس جائے گی، ہمیں اس کا بھی انتظام کرنا ہے۔ ہم بہت سے گڑھوں کو پاٹ دیں گے اور بہت سے گڑھوں کے اندر پانی دوڑا دیں گے۔ اس سے زمین بھی مضبوط ہو جائے گی اور آب و ہوا پر بھی اثر پڑے گا۔ مستقبل کے استالن گراد کا حسن اس تصویر میں پوری طرح نظر نہیں آسکتا، لیکن یہ بڑا خوب صورت شہر ہے۔"

میں نے اعتراض کیا کہ "نئی عمارتوں میں گنبد یا مینار نہیں ہیں۔ میں چونکہ ایک مشرقی ملک سے آیا ہوں اور دہلی اور لکھنؤ جیسے شہروں کا نادی ہوں۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ جس شہر کی عمارتوں میں گنبد یا مینار یا اس قسم کی چیزیں نہ ہوں وہ شہر اوپر سے سپاٹ معلوم ہوگا، آسمان کے افق پر شہر کی جو لکیر بنے گی وہ بہت خوب صورت نہیں ہوگی۔"

لیساف مسکرا دیا اور کہنے لگا "شہروں کا حسن محض گنبدوں اور میناروں سے نہیں ہوتا۔ ویسے پرانے گرجوں اور عبادت گاہوں کے گنبد اور مینار بہت حسین ہوتے ہیں۔ ماسکو کے کراملن میں یہ حسن موجود ہے اور ہم اس سے ناواقف نہیں ہیں، لیکن جدید شہر کا حسن بھی جدید ہوگا۔ وہ بعض اوقات اجنبی اس لئے بھی معلوم ہوتا ہے کہ پرانے شہروں کا حسن تضاد پر مبنی ہے۔ بڑی بڑی خوب صورت عمارتوں کے پاس ٹوٹے پھوٹے مکانات اور چھوٹے چھوٹے جھونپڑے بھی مل جاتے ہیں۔ اس تضاد میں ایک خاص قسم کا حسن محسوس ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ غیر طبقاتی سماج کے نئے شہروں میں یہ حسن نہیں ہو سکتا۔"

چلتے وقت مجھ سے لیساف نے کہا کہ "دس پندرہ برس بعد استالن گراد دیکھنے کے قابل ہوگا۔"

www.taemeernews.com

اب اس شہر کی زیارت ختم ہو چکی تھی۔ میرا دل احساسات اور تصورات سے بھرا ہوا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا، جیسے استالن گراد عہد جدید کی دنیس ہے۔ جو خون کے سمندر سے باہر نکلی ہے۔ ہندوستان کے قدیم عہد میں جب دیوتاؤں اور راکھشسوں نے اپنی لڑائی میں سمندر کو متھا تھا تو اس میں سے امرت بھی نکلا تھا اور زہر بھی۔ یہ زہر ساری دنیا کو تباہ کر دیتا لیکن شیو نے اسے پی لیا۔ دوسری جنگِ عظیم میں یہ زہر استالن گراد نے پیا۔ یہ نئے عہد کا شیو ہے، تین سروں کا دیوتا جس نے بدی کو قتل کیا نیکی کی تخلیق کی اور اب امن کا محافظ ہے۔ یہ ایک نغمہ ہے جو پتھر، لوہے اور پانی سے پیدا ہو رہا ہے۔ اس نغمے میں درختوں کے ساز اور ہواؤں کے گیتوں کی آمیزش ہے۔ روٹیاں مہک رہی ہیں۔ بچوں کے چہرے گلابوں کی طرح کھلے ہوتے ہیں۔ اسکول شہد کی مکھیوں کے ہجوم کی طرح گنگنا رہے ہیں۔ بوڑھے وانگا کا دل دھڑک رہا ہے۔

جب میں اس تعمیر ہوتے خرابے کو خدا حافظ کہہ کر ہوائی اڈے پر اپنے مہربان اور گرم دل میزبانوں سے رخصت ہو رہا تھا تو موٹر ڈرائیور نے اپنی جیب سے کاغذ کی ایک بڑی سی پڑیا نکالی اور میرے ہاتھ میں دے دی۔ اس میں بم اور شل کے جلے ہوئے فولادی ٹکڑے تھے۔ ویسے ہی ٹکڑے جو مجھے ایما نے میخائیف کی پہاڑی سے اٹھا کر دیئے تھے۔

میں نے انھیں دیکھ کر پوچھا۔ "اس میں جرمن ٹکڑے کون سے ہیں اور سوویت ٹکڑے کون سے"۔

ڈرائیور نے سر ہلا کر کہا۔ "اب ان کو نہیں پہچانا جا سکتا"۔

قراقم کے ریگستانوں سے آنے والی تیز ہوا کے جھونکے اپنے سارے جاہ و جلال کے ساتھ ہوائی اڈے پر ناچ رہے تھے۔ جہاز نے اپنے پر اس ہوا کی بلندی پر پھیلا دیئے وہ کئی بار اوپر نیچے ہوا اور پھر بڑی آسانی سے اڑنے لگا۔ میری آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہو گئیں۔ جہاز کی آواز ہلکی ہوتے ہوتے بالکل ڈوب گئی۔

www.taemeernews.com

ایک سناٹا اور پھر ساری فضا نغموں سے گونج اٹھی۔ گھاس کے وسیع میدانوں میں حدنظر تک گیہوں کا سونا پھیلا ہوا تھا۔ اور اس سنہری سمندر میں ہزاروں ٹریکٹر ناچ رہے تھے اور ان کا فولاد کہہ رہا تھا کہ جب ٹینک بنتے ہیں تو وہ آپس میں ٹکراتے ہیں۔ لیکن جب ٹریکٹر بنتے ہیں تو وہ مل کر ناچتے ہیں۔ یہاں آکر جرمن فولاد اور سویت فولاد ایک ہو جاتا ہے۔ ٹریکٹر ناچ رہے تھے اور ان کے ساتھ ایما، اوکسانا، مارگریٹا، اور گالا بھی ناچ رہی تھیں، اور یوری گا رہا تھا، سورج، چاند اور ستارے نیچے اتر آئے تھے اور گیہوں کے کھیتوں کے چاروں طرف حلقہ باندھے ناچ رہے تھے۔ گالا نے ہاتھ بڑھا کر ایک ستارے کو پکڑ لیا، اور اپنی پیشانی پر لگا لیا، ایک ٹریکٹر سے ایک نوجوان اترا اور اس نے دوسرا ستارہ لے کر گالا کی ٹھوڑی پر لگا دیا، چاند ان دونوں کے گرد گھومنے لگا، گالا اور نوجوان ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر چاند پر بیٹھ گئے۔ تارے ناچتے رہے، ٹریکٹر ناچتا رہا۔ ایما، اوکسانا اور مارگریٹا ناچتی رہیں۔ یوری گیت گاتا رہا۔ اور چاند گالا کو اس کے نوجوان دوست کے ساتھ اپنی ہتھیلی پر بٹھا کر اونچا ہو گیا، سورج زمین پر بیٹھ گیا۔ اور اپنی ہنسی ہوئی نگاہوں سے اوپر اٹھتے ہوئے چاند کو دیکھتا رہا۔ گالا نے وہاں سے پکار کر کہا، "زمین بڑی خوب صورت نظر آ رہی ہے۔ یہ استالن گراد ہے، وہ دہلی وہ پیکنگ، وہ شیراز، وہ پیرس، وہ لندن اور وہ دیکھو ماسکو ہے"۔

اوکسانا میرا شانہ پکڑ کر ہلا رہی تھی۔ "وہ دیکھو ماسکو ہے"۔

جہاز ہوائی اڈے پر اتر رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں چاند کے سفر سے واپس آیا ہوں۔

(۱۹۵۵ء)

نوٹ:- استالن گراد کا نام اب تبدیل کر کے والگوگراد رکھ دیا گیا ہے۔

www.taemeernews.com

گردشِ پیمانۂ رنگ

بخیالِ چشمے کے می زند قدحے جنون دلِ تنگِ ما
کہ ہزار میکدہ می دود بہ رکابِ گردشِ رنگِ ما

(بیدلؔ)

غالبؔ نے ایک فارسی شعر میں کہا ہے کہ خزاں اور بہار کی اس سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں کہ ایک پیمانۂ رنگ مسلسل گردش کر رہا ہے، اس کا ایک رنگ بہار ہے، اور دوسرا خزاں۔ یہ سلسل گردش وقت کا قدیم ترین تصور ہے، کائنات کا اصولِ اول یعنی اپار اور اتھاہ پانی (آب آب رومی)، میں تیرتے ہوئے شیش ناگ پر لیٹا ہوا قادرِ مطلق وشنو اپنی شکتی، اپنی مایا کو بار بار جنم دیتا ہے۔ سنسار پھلتا پھولتا ہے۔ بگڑتا ہے، اجڑتا ہے اور پھر وشنو کے وجود کے اندر خواب بن کر محو ہو جاتا ہے۔ اور پھر جنم لے لیتا ہے۔ یہ چکر ازل سے چل رہا ہے، جس کی کوئی ابتدا نہیں، اور ابد تک چلے گا جس کی کوئی انتہا نہیں ؎

نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے

لیکن انسان جو ازلی بچہ ہے ان گریزاں رنگوں کے پیچھے اسی طرح دوڑتا ہے، جس طرح تتلیوں کے پیچھے بچے بھاگتے ہیں، اس جذبے کی ترجمانی مصحفی نے اپنے ایک

www.taemeernews.com

خوب صورت شعر میں قافلۂ بہار کو پکڑ لینے کی طفلانہ اور معصومانہ خواہش کے ساتھ کی ہے ؎

چلی بھی جا جرس غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نوبہار ٹھہرے گا

لیکن قافلۂ بہار ٹھہرنے والی چیز نہیں۔ اس کا سارا رنگ، ساری نکہت، جنبش اور گریز ہی کی رہینِ منّت ہے۔ اس لئے میر تقی میر نے اس کو پکڑنے کے بجائے اس قافلے کے ہجوم میں گم ہو جانے کا ارمان کیا ہے ؎

بوئے گل و رنگِ گل ہوتے ہیں ہوا دونوں
کیا قافلہ جاتا ہے، جو تو بھی چلا چاہے

برنگ بوئے گل اس باغ کے ہم آشنا ہوتے
کہ ہمراہِ صبا تک سیر کرتے اور ہوا ہوتے

اور انگریزی کے جوانا مرگ رومانی شاعر کیٹس نے تو مر مٹنے کی دعوت دی ہے۔ ایک خط میں لکھا ہے کہ جب شہد کی مکھی پھولوں کا رس چوس لیتی ہے تو آنے والی بہار میں پنکھڑیوں کا رنگ اور زیادہ شوخ ہو جاتا ہے۔

یہ گردشِ پیمانۂ رنگ ادب اور تہذیب کی دنیا میں بھی جاری ہے۔ فکر اور خیال کے دامن پر بکھرے ہوئے بیل بوٹے ایک بہار کے رنگ کو دوسری بہار کے رنگ سے ملا دیتے ہیں۔ اس حقیقت کو نظر انداز کر دینے سے وہ تفریق پیدا ہوتی ہے جو انسانوں کو نسلوں، رنگوں اور جغرافیائی سرحدوں میں تقسیم کر کے اسیر کر دیتی ہے۔ جب یہ حدیں محبت سے نہیں توڑی جاتیں تو نفرت سے توڑی جاتی ہیں، اور جنگ اور موت اور غارت گری سب کا خون بہا دیتی ہے، اور زمین اپنے مہربان سینے میں ہر خون کو جذب کر لیتی ہے۔

دوسری جنگ عظیم میں ہٹلر اور مسولینی کی فاشست فوجوں نے سارے یورپ کو

www.taemeernews.com

روند ڈالا، ان کے فوجی بوٹوں کی ڈراؤنی آواز ساری دنیا میں سنائی دے رہی تھی، اس قتل و غارت گری میں انسانی فکر اور تہذیب کی بے شمار قدریں خون میں نہا گئیں، ان گنت شاعر اور ادیب معمار اور فنکار موت کے گھاٹ اترے۔ شہید ہونے والوں میں بلغاریہ کا نوعمر شاعر واپت سارف بھی تھا جو نازیوں کی آریائی برتری اور جرمن اقتدار کے بہیمانہ تصور کا دشمن تھا، آخر کو انسانی تصور کی جیت ہوئی۔ اور بلغاریہ میں اشتراکی حکومت قائم ہوگئی، اگر واپت سارف زندہ رہتا تو ۱۹۵۹ء میں اس کی عمر پچاس سال کی ہوتی۔

جشن کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے مجھے بے ساختہ اقبال کا فارسی قطعہ یاد آگیا جو واپت سارف کی موت کے لئے بہت موزوں تھا ؎

سحری گفت بلبل باغباں را
دراین گل جز نہالِ غم نہ گیرد
بہ پیری می رسد خار بیاباں
ولے گل چوں جواں گردد بمیرد

(ترجمہ: ایک صبح بلبل نے باغبان سے کہا کہ اس زمین میں غم کے پودے کے سوا اور کوئی پودا جڑ نہیں پکڑتا، جنگل کا کانٹا آہستہ آہستہ بوڑھا ہو جاتا ہے، لیکن پھول جیسے ہی جوان ہوتا ہے کمہلا جاتا ہے)

جشن کے دو تین دن بعد ایک دعوت کے موقع پر بلغاریہ کے بوڑھے شاعر لامار نے ایک طویل نظم سنائی جو اس نے اقبال کے اس قطعہ سے متاثر ہو کر کہی تھی۔ اس نظم کو سن کر میری آنکھوں کے سامنے سے صدیوں کے حجابات اٹھ گئے۔ اور میں نے محسوس کیا جیسے میں بیک وقت قدیم یونان، ایران، جرمنی، ہندوستان سب کی سیر کر رہا ہوں اور میرے چاروں طرف شعر و نغمے کے آبشار گنگنا رہے ہیں۔

دو ڈھائی ہزار سال پہلے مقدونیہ کے اسی علاقے سے جس کے ایک ایک شہر بانسکو میں واپت سارف پیدا ہوا تھا، ایک فاتح اٹھا تھا اور اس کا نام سکندر اعظم تھا، ارسطو

www.taemeernews.com

اس کا استاد اور اتالیق تھا۔ یہ طوفان ایران اور افغانستان سے گذرتا ہوا دریائے سندھ کے ساحلوں سے ٹکرایا، ہندوستان میں پورس کی شکست ہوئی۔ چندرگپت موریہ کے دربار میں یونانی لڑکیاں ساریوں میں لپٹی ہوئی نظر آئیں، ایران میں سکندر نے نوشابہ سے محبت کی۔ گندھارا میں گوتم بدھ کا پہلا مجسمہ بنایا گیا، جس کا چہرہ یونانی دیوتا اپالو کی شکل کا تھا، بدھ کا لفظ جو گیان اور عرفان کے ہم معنی تھا، بت میں تبدیل ہوگیا اور فارسی زبان میں مجسمے اور معشوق کے معنوں میں استعمال ہونے لگا اور پھر ایران سے ہندوستان میں ایک اجنبی لفظ بن کر داخل ہوا اور اردو زبان اور شاعری میں گھل مل کر ہماری زبان کا لفظ بن گیا۔

اسی یونان سے علم اور فلسفے کے دھارے بھی بہے اور مشرق اور مغرب کی سرزمینوں کو سیراب کرتے رہے۔ لیکن نوفلاطونی عہد تک پہونچتے پہونچتے ان میں بابل، و نینوا کی تہذیبی اقدار اور عبرانی پیغمبروں کی آوازیں شامل ہو چکی تھیں۔ دہقانی، نسلی اور شہری ریاستوں کے حدود میں اسیر دیوتاؤں کے بجائے ایک ان دیکھے خدائے واحد کے نام پر ایک وسیع تر انسانی برادری کا تصور پہلی بار پیش کر رہے تھے۔ اب صورت کے تنوع اور معنی کی وحدت کے تضاد کو فلسفیانہ سطح پر سمجھنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ ہندوستان سے ویدانت اور اپنی شد کی ہوائیں چل رہی تھیں۔ اور مشرق قریب کے علاقوں سے مسیحی تصورات کا نور پھیل رہا تھا۔ اسکندریہ کے بازاروں میں مشرق اور مغرب کے مال کا تبادلہ ہو رہا تھا، اور وہاں کی دانش گاہوں میں یونانی اور مسیحی تعلیمات ایک دوسرے کے شانوں سے شانہ رگڑ رہی تھیں۔ ایران میں نوشیرواں کے دربار میں زرتشتی تصورات کے ساتھ ساتھ نوفلاطونی تصورات بھی بار پا رہے تھے، اور پھر مشرق وسطیٰ میں گوتم بدھ کی محبت بھری آواز گونج رہی تھی اور وہاں کے وہاروں میں محبت، مکتی اور نروان کے نئے عقیدے انسانیت کے درد اور دکھ کے سمجھنے اور زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تصورات، خیالات اور عقائد اس طرح گھل مل رہے تھے جیسے مختلف دریاؤں کا پانی سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ متضاد سمتوں سے

www.taemeernews.com

چلنے والی ہوائیں آپس میں ہم آغوش ہو جاتی ہیں۔
بہاروں کا سفر جاری ہے۔ پیمانۂ رنگ گردش کر رہا ہے۔

عرب کے ریگ زاروں سے ہدایت کا ایک نیا چشمہ پھوٹا، جس نے بلا تفریق حبش کے بلال اور فارس کے سلمان اور عرب کے ابوذر غفاری کی پیاس بجھائی۔ لیکن بہت جلد وہاں کی سوکھی ہوئی ریت اور خشک ہواؤں نے اس آبِ زلال کو جذب کرنا شروع کر دیا۔ اور پیغمبرِ اسلام کی وفات کے تیس سال کے اندر اختلافات پیدا ہو گئے۔ وہ جو رحمت اور شفقت بن کر آیا تھا، اس کے نام پر مصر سے لے کر ایران اور دریائے سندھ کے ساحلوں تک فوجی فتوحات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پانی اور زمین پر انفرادی قبضہ ہو گیا، اور اسلامی دنیا مکمل جاگیردارانہ نظام میں تبدیل ہو گئی، اور جاگیرداری شہنشاہیت نے خلافت کا تاج سر پر رکھ لیا، اب بقول اقبال کے شام اور بغداد کی شوکت ایک طرف تھی اور ساحلِ فرات پر بہتر پاک روحوں کی شہادت دوسری طرف ؎

ایں دو قوت از حیات آمد پدید
موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید

عرب کے فاتحین مشرق اور مغرب کے ممالک کو فتح کر رہے تھے، لیکن مشرق و مغرب کے علوم اور فلسفے عربوں کو شکست دے رہے تھے، ایران میں غلاموں، کسانوں اور دستکاروں کی بغاوتیں ہو رہی تھیں اور بغداد کے عربی دربار میں ایرانی امراء کا اقتدار بڑھ رہا تھا، عباسی خلفاء کی سرپرستی میں یونانی علوم اور فلسفے کی کتابوں کے ترجمے ہو رہے تھے، افلاطون اور ارسطو کے نام عربی انداز اختیار کر رہے تھے۔ اور ان کی سلطنت کے گوشے گوشے سے اخوان الصفا اور معتزلہ عقل پرستی اور ذہنی وسعت کا پیغام دے رہے تھے۔

عرب اقتدار کی جاگیرداری گرفت جتنی سخت ہوتی جاتی تھی۔ ایرانی دانش وروں اور شاعروں کی آوازیں اتنی ہی بلند ہوتی جا رہی تھیں۔ فردوسی، ناصر خسرو اور عمر خیام کی شاعرانہ نوا سنجی جاگیرداری فکر کے مستحکم نظام میں شگاف ڈال رہی تھی اور ابو علی سینا کی فکر

www.taemeernews.com

ایک نئے نظامِ حیات کی بشارت لئے ہوئے تھی۔ اب ایران کا خطہ ایک میخانہ تھا، جس میں ایک طرف سے ویدانت، اپنی شد اور بودھ تصورات کا آبِ حیات اور زرتشتی اور مزدکی شراب میں مل جانے کے بعد دو آتشہ سے آتشہ تیار ہو رہا تھا۔ اسلام کئی حصّوں میں بٹ گیا تھا، لیکن اس کے اہم ترین حصے دو تھے۔ ایک سرکاری اور صاحبِ اقتدار طبقے کا اسلام تھا، اور دوسرا عوام کا اسلام۔ ایک شریعت تھا اور دوسرا طریقت۔ ایک مذہب تھا اور دوسرا تصوف۔ ایک ظاہری مذہب تھا اور دوسرا باطنی۔ جاگیرداری فکری نظام پر یہ سب سے بڑا حملہ تھا جو بارہویں صدی سے لے کر سولہویں صدی تک دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مختلف ناموں مختلف شکلوں اور مختلف لباسوں میں پھیلا ہوا تھا، کہیں اس کا نام مسٹی سزم تھا، کہیں تصوف، کہیں بھگتی، کہیں چی این اور کہیں ژن۔ اس کا ظاہری لباس مذہبی تھا لیکن اندرونی اور داخلی حقیقت انقلابی اور باغیانہ۔

تصوف قرونِ وسطیٰ میں انسان دوستی کی عظیم ترین تحریک کی شکل میں ابھرا تھا، جس نے رقص، سرود اور شاعری کو حربہ بنا دیا تھا اور عشق، محبت، گناہ اور مستی کو روحانی انداز دے دیا تھا، اس کا سب سے بڑا حملہ اُن اہل کاروں پر تھا، جنھیں سعدی نے شمر ذی الجوشن اور یزید سے تشبیہہ دی ہے، ان میں مذہبی اہل کار بھی تھے جو خدا اور بندے کے درمیان حائل تھے، اور سرکاری اہل کار بھی تھے جو جاگیرداری ریاست کو چلاتے تھے اور بادشاہ اور رعیت کے درمیان حائل تھے اور چونکہ ریاست اور کلیسا ایک دوسرے کے حامی تھے اس لئے مذہبی اہل کار اور سرکاری اہل کار کبھی کبھی ایک بھی ہو جاتے تھے۔ سرکاری مذہب کا خدا قہار اور جبار تھا اور صوفیوں کا خدا انسانوں کے عیوب چھپانے والا رحیم وکریم اور شفقت کرنے والا۔ اس لئے صوفی انا الحق کہنے کی بھی ہمت کر لیتا تھا، چاہے اسے دار ہی پر کیوں نہ کھینچ دیا جائے۔

مولانا جلال الدین رومی نے ایک بڑا دلچسپ نکتہ پیدا کیا ہے اور وہ یہ کہ انا الحق انکسار کی آخری منزل ہے، جس طرح شہد میں ڈوبی ہوئی مکھی ہل نہیں سکتی اس طرح عالم استغراق

www.taemeernews.com

میں کوئی صوفی انا العبد (میں بندہ ہوں) نہیں کہہ سکتا، کیونکہ انا العبد کہنے میں دوئی ہے، ایک خدا اور ایک بندہ۔ اور یہ غرور کی منزل ہے۔ خدا کے وجود کے سامنے اپنے وجود کا اعلان ہے، لیکن انا الحق کہنے میں "میں" کا وجود باقی نہیں رہتا۔ صرف وحدت ہی وحدت ہے، (مثنوی کا انگریزی ترجمہ از نکلسن، ج ۷)

ظاہر ہے کہ اس منزل میں کسی شفارش کرنے والے مولوی کی ضرورت نہیں ہے اسی استعارے کو ذرا اور پھیلا دیا جائے تو رعایا ہی بادشاہ ہے اور سرکاری اہل کار فضول اور بے معنی جو صرف رعایا کو لوٹتے ہیں اور بادشاہ کے نام پر ظلم اور جبر کرتے ہیں۔

اس مقام پر رنگ، نسل، مذہب، ملت ہر طرح کی تقسیم ختم ہو جاتی ہے، اور صرف انسانیت باقی رہتی ہے جس کی آخری معراج انا الحق ہے۔

انسانیت کا یہ عظیم الشان تصور صوفی افکار کے ذریعے سے ایک نئے آفتاب کا نور بن کر ایران کے عظیم شعراء کی شاعری میں جلوہ گر ہوا اور اس کا عکس سعدی اور حافظ کی شاعری پر پڑ رہا ہے جس میں عشق، گناہ اور مستی کی عظمت ہے اور حسن کی ہمہ گیری۔ یہاں گناہ دنیا کو برتنے کا ایک پردہ ہے، اسی گناہ نے آدم کو نیکی اور بدی کے تصور سے آشنا کیا تھا اور بہشت سے نکال کر زمین پر خلافت قائم کی تھی، یہ مصلحت خداوندی تھی۔ عشق انسانوں کے احترام کا ایک ذریعہ ہے جس میں دو ضدوں کی وحدت میں اور تو کے فرق کو مٹا دیتی ہے۔ خدا تو دکھائی نہیں دیتا، اس لئے محبت کا دعویٰ کرنے والے اگر دکھائی دینے والے انسان سے محبت نہیں کر سکتے تو مکاری کے سوا اور کس چیز کے مرتکب ہوں گے اور مستی جو جاگیر داری عہد کی آویزشوں سے بچنے کا ایک بہانا بھی ہے۔ احساس حسن کے سوا ہر چیز سے بے نیازی کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاضی اور محتسب، ملّا اور مفتی پر پھبتیاں کسنے والا حافظ اتنا خوشنوا ہے۔

حافظ کی خوب صورت غزلوں نے پانچ چھ سو سال میں ایران کے ساتھ ساتھ ساری دنیا کا دل موہ لیا، اس کی شاعری آج بھی ہوا کے جھونکوں کے ساتھ محو سفر ہے۔ میں

www.taemeernews.com

انیسویں صدی کے ابتدائی زمانے میں جب فان ہیمر نے ۱۸۱۲ء میں دیوان حافظ کا ترجمہ جرمن زبان میں شائع کیا تو جرمن ادبیات میں مشرقی تحریک کا آغاز ہوا اور جرمن زبان کا سب سے بڑا شاعر گوئٹے حافظ کا گرویدہ ہوگیا۔ اور اس نے اپنی نظموں کا ایک مجموعہ "مغربی دیوان" کے نام سے شائع کیا۔ اقبال کے الفاظ میں "یہ وہ زمانہ تھا جب کہ جرمن قوم کا انحطاط ہر پہلو سے انتہا تک پہونچ چکا تھا، ملک کی سیاسی تحریکوں میں عملی حصہ لینے کے لئے گوئٹے کی فطرت موزوں نہ تھی اور یورپ کی عام ہنگامہ آرائیوں سے بے زار ہوکر اس کی بے تاب اور بلند پرواز روح نے مشرقی فضا کے امن وسکون میں اپنے لئے ایک نشیمن تلاش کرلیا، حافظ کے ترنم نے اس کے تخیلات میں ایک ہیجانِ عظیم برپا کردیا جس نے آخر کار مغربی دیوان کی ایک پائیدار اور مستقل صورت اختیار کرلی۔"

اقبال نے اس سلسلہ میں گوئٹے کے مشہور سوانح نگار بیل سوشکی کا ایک اقتباس بھی نقل کیا ہے:

"بلبلِ شیراز کی نغمہ پردازیوں میں گوئٹے کو اپنی ہی تصویر نظر آتی تھی، اس کو کبھی کبھی یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ شاید میری روح ہی حافظ کے پیکر میں رہ کر مشرق کی سرزمین زندگی بسر کرچکی ہے۔ وہی زمینی مسرت، وہی آسمانی محبت، وہی سادگی، وہی عمق، وہی جوش وحرارت، وہی وسعتِ مشرب، وہی کشادہ دلی اور وہی قید و رسوم سے آزادی۔ غرض کہ ہر بات میں ہم اسے حافظ کی مثل پاتے ہیں، جس طرح حافظ لسان الغیب اور ترجمانِ اسرار ہے، اسی طرح گوئٹے بھی ہے اور جس طرح حافظ کے بظاہر سادہ الفاظ میں ایک جہانِ معنی آباد ہے اسی طرح گوئٹے کے بیساختہ پن میں بھی حقائق واسرار جلوہ افروز ہیں۔ دونوں نے امیر وغریب سے خراجِ تحسین وصول کیا دونوں نے اپنے اپنے وقت کے عظیم الشان فاتحوں کو اپنی شخصیت ۔ ۔ ۔ ۔ ژکیا (یعنی حافظ نے تیمور کو اور گوئٹے نے نپولین کو) اور دونوں عام تباہی اور بربادی کے زمانے میں طبیعت کے اندرونی اطمینان وسکون کو محفوظ رکھ کر اپنی قدیم ترنم ریزی جاری رکھنے میں کامیاب

www.taemeernews.com

رہے"۔ (دیباچہ۔ پیامِ مشرق)

اور گوئیٹے کے سو برس کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے عظیم شاعر اقبال نے اس کے جواب میں اپنی مشہور فارسی کتاب "پیام مشرق" لکھی، جس پر حافظ اور گوئیٹے دونوں کا بھرپور اثر ہے اور اقبال نے اس کتاب کے ذریعے سے دنیا کو امن و محبت کا خوب صورت پیام دیا۔ اہم بات یہ نہیں ہے کہ اقبال نے اپنی اس کتاب میں حافظ کی زمینوں میں غزلیں کہی ہیں اور گوئیٹے کی بعض نظموں کے ترجمے کئے ہیں، بلکہ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ شاعری ملکوں کی جغرافیائی سرحدوں کو توڑ دیتی ہے اور پہاڑوں اور ریگستانوں اور دریاؤں کو پار کر کے انسانی اقدار سے ایک محبت بھری دنیا بناتی ہے جو وقتی حکومتوں اور ان کے قوانین سے بالاتر ہوتی ہے۔

حالانکہ اقبال نے عجمی تصوف کی تمام عمر مخالفت کی اور ایک وقت ایسا بھی آیا جب خود حافظ کے خلاف ایک نظم لکھ دی، لیکن ایرانی تصوف نے محبت اور انسانیت کی جو حسین قدریں دی تھیں انھیں اقبال کو قبول کرنا پڑا اور یہ جواہرات اقبال کے پورے کلام میں بکھرے ہوئے ہیں۔

حافظ کا ایران مقامی خانہ جنگیوں اور تیموری یلغاروں کی آماجگاہ تھا اور گوئیٹے کے یورپ میں نپولین کی فوجیں کوچ کر رہی تھیں اور اقبال کی دنیا پہلی جنگ عظیم کی تباہ کاریوں اور سرمایہ داری شہنشاہیت کے جبر و تشدد کا شکار تھی۔ گوئیٹے کے "مغربی دیوان" سے "پیامِ مشرق" کی تحریک کیسے ہوئی، اس کے متعلق اقبال نے خود لکھا ہے کہ "سو سال پیشتر کے جرمنی اور مشرق کی موجودہ حالت میں کچھ نہ کچھ مماثلت ضرور ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقوامِ عالم کا باطنی اضطراب جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہم محض اس لئے نہیں لگا سکتے کہ خود اس اضطراب سے متاثر ہیں، ایک بہت بڑے روحانی اور تمدنی انقلاب کا پیش خیمہ ہے، یورپ کی جنگِ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لئے

www.taemeernews.com

ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے"۔

اس نئی دنیا پر اقبال کی نظر ضرور پڑی جو اشتراکی انقلاب (۱۹۱۷ء) کی شکل میں ظہور پذیر ہوئی تھی، لیکن عجمی تصوف کی طرح اس کی بھی بعض خوب صورت اقدار کو قبول کر لینے کے باوجود اقبال کا ذہن اس کی حقیقی اہمیت کا اندازہ نہیں کر سکا، پیمانۂ رنگ کی اس گردش میں بہار کے ساتھ خزاں کے رنگوں کی آمیزش کتنی دلچسپ ہے۔

اقبال کی نگاہ آفاق گیر تھی، اس لئے پیام مشرق میں ہنگامی موضوعات کی آلودگی نہیں ہے، لیکن ماضی اور مستقبل کی خبر صرف آج کا گریزاں لمحہ ہی دیتا ہے اس لئے لمحات کی پرچھائیوں سے بچنا اقبال کے لئے ممکن نہیں تھا اور پیام مشرق میں ہنگامی حالات کا عکس دیکھا جا سکتا ہے، جس میں سب سے زیادہ اہم پہلی جنگ عظیم کی تباہ کاری، برطانوی شہنشاہیت، انقلاب روس اور ہندوستان کی سیاسی بیداری تھی، نظموں کے علاوہ بعض قطعات میں بھی اس آگ کا سراغ ملتا ہے، جو ہمارے ملک اور قوم کے سینے میں دہک رہی تھی۔

گاندھی جی سے اقبال کو بہت زیادہ دلچسپی نہیں تھی، لیکن پھر بھی جب ایک برطانیہ پرست اخبار نے ایک کارٹون شائع کیا کہ گاندھی جی بھارت ماتا کو جس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوتی ہے، ایک طوفان زدہ سمندر میں لے کر کودنے والے ہیں، تو اقبال نے قلم اٹھا کر اس کے نیچے یہ مصرعے لکھ دیئے اور کارٹون کا مفہوم بدل گیا اور موت زندگی میں تبدیل ہو گئی ؎

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا
نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش در آویز
حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

پیامِ مشرق میں اس واقعہ کا کوئی ذکر نہیں ہے، لیکن یہ قطعہ موجود ہے اور اس

www.taemeernews.com

واقعے سے الگ بھی اپنی معنوی وسعت اور ہمہ گیری سے محروم نہیں ہے۔

کیا عجب ہے کہ تحریک آزادی کے نوعمر مجاہدوں نے بھی اقبال کو متاثر کیا ہو، (جلیان والا باغ پر دو مصرعوں میں اقبال کے آنسو ٹپکے تھے) اور پیام مشرق میں ایسے قطعات اور اشعار کی کمی نہیں ہے، جن کا اطلاق ہندوستان اور ہندوستان کے باہر آج کے عہد کے باطنی اضطراب سے پیدا ہونے والے بہت سے طوفانوں پر ہو سکتا ہے، اور اسی لئے اس میں ایک ایسا قطعہ بھی نکل آیا جو تیئیس تیتیس سال کی نوعمری میں شہید ہونے والے واپت سارف پر صادق آگیا۔ اس جوانامرگ شاعر کو اس سے بہتر خراج عقیدت میں اور کیا پیش کر سکتا تھا ؎

سحر می گفت بلبل باغباں را
دریں گل جز نہالِ غم نہ گیرد
بہ پیری می رسد خار بیاباں
ولے گل چوں جواں گردد بہ میرد

اور جب لامار نے اس سے متاثر ہو کر اپنی طویل نظم پڑھی تو میں نے دیکھا کہ اس محفل میں ایک یونانی شاعر بھی موجود ہے اور میں نے اس سے مخاطب ہو کر کہا کہ یونانی فکر نے ایران اور حافظ کو متاثر کیا۔ حافظ نے گوئٹے کو اپنا گرویدہ بنایا، گوئٹے نے اقبال کو نغمہ سنج کر دیا اور اقبال کے قطعے نے بلغاریہ کے لامار کو اتنی حسین نظم کہنے پر اکسایا۔ بس اتنی بات باقی ہے کہ اگر یونانی شاعر بھی لامار کی نظم پر ایک نظم کہہ دے تو گردش پیمانۂ رنگ مکمل ہو جائے گی۔

انسانی وحدت کے لئے اس سے بہتر تحفہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

▬ ▬ ▬

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان

تالیف : محمود احمد برکاتی

صفحات : 152

قیمت : -/63 روپے

سرسید سے اقبال تک

مرتبین : شمیم حنفی
سہیل احمد فاروقی

صفحات : 192

قیمت : -/72 روپے

لپطرس کے مضامین

مصنف : احمد شاہ بخاری

صفحات : 156

قیمت : -/54 روپے

نیا اُردو نصاب

مرتبہ : محمد ذاکر

صفحات : 88

قیمت : -/48 روپے

موازنۂ انیس و دبیر

مصنف : شبلی نعمانی

صفحات : 304

قیمت : -/81 روپے

منتخبہ

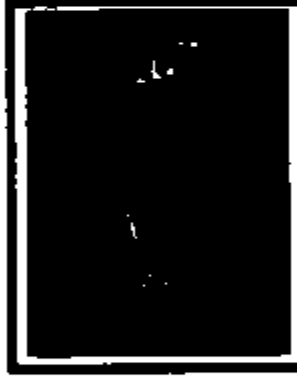

مصنف : یوسف ناظم

صفحات : 96

قیمت : -/50 روپے

مفکرینِ تعلیم

مصنف : محمد اکرام خاں

صفحات : 184

قیمت : -/72 روپے

مذہب اور جدید ذہن

مصنف : مشیر الحق

صفحات : 120

قیمت : -/56 روپے

ISBN: 978-81-7587-944-7

9 788175 879447

₹ 91/-